۱۰۔ علامہ ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ، احکام القرآن ج ا ص ۳۲۹، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور ۱۴۰۰ھ

۱۱۔ علامہ بدر الدین عینی حنفی متوفی ۸۵۵ھ، عمدۃ القاری ج ا ص ۱۹۹، مطبوعہ ادارۃ الطباعۃ المنیریہ مصر، ۱۳۴۸ھ

۱۲۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری ج ا ص ۳۲۲، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی ۱۳۸۱ھ

۱۳۔ امام ابوعبداللہ محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، صحیح بخاری ج ا ص ۳۲۲، مطبوعہ نور محمد کارخانہ تجارت کتب کراچی ۱۳۸۱ھ

۱۴۔ امام محمد بن اسماعیل بخاری متوفی ۲۵۶ھ، صحیح البخاری ج ا ص ۳۳۲، مطبوعہ نور محمد اصح المطابع کراچی، الطبعہ الاولیٰ ۱۳۸۱ھ

۱۵۔ لوئیس معلوف الیسوعی، المنجد ص ۵۳، مطبوعہ المطبعۃ الکاثولیکیۃ بیروت، الطبعۃ الثامن عشرۃ ۱۹۲۷ء

۱۶۔ میر سید شریف متوفی ۸۱۶ھ، کتاب التعریفات ص ۷۷، مطبوعہ المطبعۃ الخیریہ مصر، الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۰۶ھ

۱۷۔ علامہ ابن عابدین شامی متوفی ۱۲۵۲ھ، ردالمحتار ج ۵ ص ۳۵۵، مطبوعہ مطبع عثمانیہ استنبول، ۱۳۲۷ھ

۱۸۔ علامہ ابوبکر احمد بن علی رازی جصاص حنفی متوفی ۳۷۰ھ، احکام القرآن ج ا ص ۳۲۹، مطبوعہ سہیل اکیڈمی لاہور، ۱۴۰۰ھ

۱۹۔ امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، تفسیر کبیر ج ۳ ص ۲۳۰، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۳۹۸ھ

۲۰۔ علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۵۱، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ

۲۱۔ علامہ ابوعبداللہ محمد بن احمد مالکی قرطبی متوفی ۶۶۸ھ، الجامع لاحکام القرآن ج ۳ ص ۵۲، مطبوعہ انتشارات ناصر خسرو ایران ۱۳۸۷ھ

۲۲۔ علامہ موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ، المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ

۲۳۔ علامہ موفق الدین ابو محمد عبداللہ بن احمد بن قدامہ حنبلی متوفی ۶۲۰ھ، المغنی ج ۱۰ ص ۱۷۳۔۱۷۱، مطبوعہ دار الفکر بیروت، ۱۴۰۵ھ

۲۴۔ علامہ ابوالبرکات عبداللہ بن احمد بن محمود نسفی متوفی ۷۱۰ھ، کنز الدقائق ص ۲۳۰، مطبوعہ محمد سعید اینڈ سنز کراچی

۲۵۔ علامہ عثمان بن علی زیلعی متوفی ۷۴۳ھ، تبیین الحقائق ج ۶ ص ۲۲۷، مطبوعہ مکتبہ امدادیہ ملتان۔

۲۶۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی متوفی ۱۳۹۹ھ، رسائل و مسائل ج ۳ ص ۳۳۶، مطبوعہ چین اسلامک پبلشرز لاہور بار پنجم ۱۹۷۵ء

عہدِ جاہلیت میں عرب کا سیاسی نظام

محترمہ فرح سہیل

لیکچرار شعبہ اسلامی تاریخ، جامعہ کراچی

جزیرۃ العرب کے سیاسی حالات پر تاریخی اور تحقیقی نگاہ ڈالنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ عرب میں عہد قدیم سے ہی شاندار حکومتوں کا سلسلہ متواتر چلا آ رہا تھا۔ اس ضمن میں شمالی اور جنوبی عرب میں شاندار حکومتیں قائم ہوئیں۔ یورپ کی تحقیقات حال سے بھی شمالی اور جنوبی عرب کے اعلیٰ درجہ کے تمدن کا ثبوت ملتا ہے۔

پروفیسر نولڈیکی جرمنی کا مشہور مستشرق لکھتا ہے:

"ولادت مسیح سے ہزار سال قبل جنوبی و غربی عرب یعنی یمن میں جو حمیر اور سبا کا ملک تھا اور جو اپنی بارش گرما کے باعث زراعت کے لیے نہایت موزوں تھا، تمدن کے اس درجہ تک پہنچ چکا تھا کہ اس کے کثیر التعداد کتبات اور شاندار عمارات کے آثار سے آج بھی ہمارے جذبات مدح و ستائش کو تحریک حاصل ہوتی ہے۔ اور اہل یونان و روم نے اسکو "دولتمند عرب" کا جو لقب دیا تھا وہ بجا تھا۔ توراۃ میں متعدد عبارتیں ہیں جو سبا کی عظمت و ثروت کی شہادت دیتی ہیں۔ چنانچہ ملکہ سبا کا سلیمانؑ سے ملاقات کا قصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

قوم ثمود کی عمارات سے ڈاؤٹی اور یوٹنگ کی محنتوں نے ہم کو روشناس کر دیا۔ نیز نبطی قوم نے جو ثمود سے بہت ملتی جلتی ہے، اپنے تمدن کی ابتدائی تعلیم غالباً انھی سے حاصل کی ہے۔

کتابت کا فن انھوں نے بہت ابتدائی زمانہ میں شمال سے لیا تھا۔ اب اس کو خود انھوں نے عرب کے اکثر حصوں میں ہر طرح کے کاروبار میں جاری کر دیا یہاں تک کہ ایک طرف دمشق اور دوسری طرف ابی سینیا تک اسکو پھیلا دیا۔[1]

لیکن وسطی عرب کے اصلی اور اندرونی مقامات پر شمالی اور جنوبی تہذیب و تمدن کے اثرات مکمل طور پر نہ پہنچ سکے، کیونکہ وسطی عرب کا طرز زندگی قبائلی تھا۔ معاشرہ میں ع حضروی و بدوی کی تقسیم موجود تھی۔ اس مختلف

طرز زندگی کا اثر ان کے ذریعہ معاش پر ہوا اور اس اختلاط ذریعہ معاش کے اثرات براہ راست ان کی سیاست پر مرتب ہوئے۔ اسلیے ہمیں وسطی عرب میں کوئی منظم ریاست یا حکومت نظر نہیں آتی۔ حالانکہ قصی نے مکہ میں ایک شہری ریاست قائم کی، لیکن قصی کی وفات کے بعد وہ بھی انتشار کا شکار رہی۔

لہذا یہ کہنا کہ جزیرۃ العرب میں کبھی کوئی ملک گیر حکومت قائم ہوئی نہ یہاں کبھی کوئی نظم و ضبط اور قاعدہ قانون تھا اور نہ ہی کوئی تنظیم اور سیاسی وحدت موجود تھی، غلط ہے۔

عرب کی تہذیب اور تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ اس سرزمین پر انسانی آبادی، کیونکہ اس سرزمین کو امم سامیہ کا مسکن ہونے کا شرف حاصل رہا ہے۔ اہل عرب ابتدائے تاریخ سے تمدن و حضارت اور حکومت و سلطنت سے واقف رہے ہیں اور انہیں سیاست کا واضح شعور رہا ہے۔ مارگولیتھ کا کہنا ہے کہ

"کتبات سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ عرب میں منظم ریاستوں کا ایک سلسلہ نامعلوم زمانے سے چلا آرہا ہے۔ اس علاقے سے ایک منظم سیاسی تنظیم کی یادیں وابستہ ہیں جو اپنی روایات اور رسوم رکھتی ہیں اور جن کے پیچھے ایک تاریخ موجود ہے"۔ ۷

عرب کے سیاسی حالات پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں قوم نوح کی بربادی کے بعد سب سے پہلی اور عظیم الشان حکومت قوم عاد کی قائم ہوئی۔ جسکا ذکر قرآن شریف میں ان الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ

"اے عاد کے لوگوں خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ اس نے قوم نوح کے بعد تمکو اپنی خلافت عطا کی"

(سورہ اعراف:۶۹)

عاد ایک محدود مختصر قبیلہ نہ تھا بلکہ ایک عظیم الشان قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی، عاد کی عظمت و ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ق م سے ۱۷۰۰ق م ہے۔ عاد کی مرکزی آبادی عرب کے بہترین حصہ یعنی یمن و حضر موت میں سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایشیاء و افریقہ کا کثیر حصہ انکے زور و قوت کا تماشا گاہ تھا۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں انکے دست صنعت کا نتیجہ تھیں۔ ۸

قرآن بھی یہی کہتا ہے

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ الَّتِىْ لَمْ يُخْلَقْ مِثْلُهَا فِى الْبِلَادِ

تونے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے اس عاد ارم کے ساتھ کیا کیا؟ جو بڑی بڑی عمارتوں کے بانی تھے جنکی نظیر دنیا میں نہیں پیدا کی گئی۔ (سورہ فجر:۸۔۶)

امم سامیہ اولیٰ یا عاد کی سیاسی تاریخ کی دو جولانگاہیں ہیں۔ ایک بیرونی ملک عرب اور دوسری اندرون عرب۔ بیرون عرب ان کی حکومتیں پہلے مرحلے میں بابل، مصر اور دیگر ممالک میں ۲۲۰۰ق م سے ۱۹۰۰ق م تک اور دوسرے مرحلے میں حضر موت سواحل سے خلیج فارس کے طول میں عراق تک عاد ثانیہ۔ عرب میں حجاز سے حدود سینا

تک ثمود۔ یمامہ میں طسم و جدیس اور یمن میں اہل معین نے حکومتیں قائم کیں۔ ہے جدید تحقیقات اسکی تائید کرتی ہیں۔ علامہ ابن قتیبہ المتوفی ۲۷۶ھ میں اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں

"انہیں عمالیق میں یہ متعدد قومیں ہیں جو ملکوں میں منتشر ہوگئی تھیں اور ان میں سے مصر اور بابل کے بادشاہ ہیں"۔ ۹

اسی طرح مورخ ابن خلدون کی تحقیق ہے۔

"عاد اور عمالیق عراق کے بادشاہ ہوگئے"۔ ۱۰

قوم عاد کے بعد شہرت اور سیاسی جانشینی ثمود کو حاصل ہوئی۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ

"ثمود یاد کرو کہ خدا نے تمکو عاد کے بعد جانشین بنایا" (اعراف:۷۳)

ثمود عرب کے شمال و مغربی حصوں پر قابض تھے جنکا نام وادی القری تھا۔ انکا دار الحکومت حجر تھا۔ یہ شہر اس قدیم راستے پر واقع ہے جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی فن تعمیر میں عاد کی طرح اسکو بھی کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا۔ پتھروں کی عمارات و مقابر تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ قرآن مجید نے ان کی عظمت تعمیر کا متعدد آیات میں ذکر کیا ہے۔

و ثمود الذين جابوا الصخر بالواد

اور ثمود جو وادی میں (بغرض تعمیر) پتھر تراشا کرتے تھے۔ (فجر:۹)

و بوأكم في الارض تتخذون من سهولها قصورا و تنحتون الجبال بيوتا

"اور ثمود جو وادی میں (بغرض تعمیر) پتھر تراشا کرتے تھے (صالح نے کہا اے لوگو) خدا نے تمکو زمین میں جگہ دی جس کے میدانوں میں تم قصر و محل اور پہاڑوں کو کاٹ کر گھر بناتے ہو"۔ (اعراف۔۱۰)

ان کی یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ ان پر آرامی و ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں۔ لیکن انہیں سے اکثر آرامی کتابت نبطی اقوام کی ہیں جنہوں نے قبل مسیح و بعد اس مقام پر حکومت قائم کی تھی۔ وہاں ان کا یہ زمانہ تقریباً ۱۸۰۰ق م تا ۱۶۰۰ق م تک ہے۔ اس قوم کی اصلاح و تعلیم کے لیے حضرت صالح ؑ ۱۱ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ ثمود اولیٰ کے جانشین اہل مدین ہوئے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۹۰۰ تا ۱۰۰۰ق م میں اہل مدین جب بنی اسرائیل کے ہاتھوں کلیتاً برباد ہوگئے تو ثمود ثانیہ نے پھر ایک بار سنبھالا لیا اور یہ وہی زمانہ ہے جس میں شاہ اشور نے شمالی عرب پر حملہ کرکے ثمود سے ۷۰۰ق م میں خراج وصول کیا۔ اسکے بعد جب رومیوں نے انباط پر حملہ کیا تو ثمود دشمنوں کے ساتھ ہوگئے اور اس خصوصیت سے تاریخ روم میں ثمود کا ذکر آیا ہے۔ ۱۲ اسلام جب آیا تو ثمود کا نام و نشان نہ تھا۔ یہاں قبائل جہینہ، بلی اور یہود اس وقت آباد تھے۔

غرضیکہ عرب کا ملک ازمنہ قدیم سے تہذیب و ثقافت کا گہوارہ رہا ہے اور اپنے ثقافتی اثرات اس نے دنیا کے دوسرے حصوں تک منتقل کئے ہیں۔ اگرچہ کہ عرب میں ریاستوں کا وجود قدیم ہے لیکن کسی زمانے میں بھی

کوئی ایک بھی گیر ریاست یا حکومت عرب میں قائم نہیں ہوئی البتہ ظہور اسلام سے کچھ پہلے چند حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں باقی تھیں۔

مثال کے طور پر حیرہ اور عراق میں ال منذر ۱۳ لخمیوں کی موروثی حکومت تھی۔ جو سلطنت فارس کے ماتحت تھی اور عرب و ایران کے درمیان ایک ظلی ریاست (Buffer State) کی حیثیت سے قائم تھی۔ آل منذر نے ساسانی دور میں بڑی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ انکا آخری حکمران نعمان بن منذر تھا۔ آل منذر کے توسط سے ساسانی خاندان نے عربوں پر اپنی برتری ثابت کی اور انہیں کے ذریعے شام کے وسیع و شاداب علاقوں کو بار بار روندا۔

عرب کے شمال میں شام کی سرحد پر آل غسان ۱۳ (بنو غسان) کی حکومت قائم تھی اور مدت دراز سے چلی آ رہی تھی اور جیسا کہ مشہور ہے کہ یہ ریاست انتداب روم کے ماتحت تھی۔ ملوک غسان کی کل تعداد ۳۲ اور ان کی مدت حکومت تقریباً ۶۰۰ سال ہے۔ انکا مرکزی حکومت بصریٰ تھا۔ غسانہ کے ایک حاکم "حارث بن ابی شمر کے عہد حکومت میں بعثت نبوی ﷺ ہوئی۔ یہ نعمان بن منذر حاکم حیرہ کا ہمعصر تھا۔ ان دونوں میں کشمکش ہوتی رہتی تھی۔ غسانہ کا آخری فرمانروا جبلہ ابن ایہم ۶۳۵ء تھا۔ بہر حال غسانیوں کی حکومت رومیوں کے زیر اثر تھی۔ بلکہ ان کے بادشاہ کو بھی وہی نامزد کرتے تھے اور غسانی حکمرانوں کا اولین مقصد رومی مفادات کا تحفظ تھا۔

ان دونوں حکومتوں کے علاوہ ایک اور حکومت جو قضاعہ کی بھی تھی۔ جس کی باگ ڈور کلب بن وبرہ کے ہاتھ میں مگر زمام حکومت کبھی کبھی کندہ کی شاخ سکون کے ہاتھ میں چلی جاتی تھی۔ چنانچہ دومۃ الجندل۔ تبوک کے مقامات۔ بنو کلب کے قبضہ میں تھے اور وہ نصرانیت اختیار کر چکے تھے۔ عمان قبیلہ دوس کا وطن اور جائے قرار تھا۔ ان کے بعد حکومت ان کے بھائیوں بنو نصر زہران کو منتقل ہوگئی۔ ظہور اسلام سے ذرا پہلے ان کے حکمران مستکبر بن مسعود جزار تھا۔ حکمران میں جس نے اسلام کا زمانہ دیکھا وہ جیفر بن الجلندی اور اسکا بھائی عیاذ تھا۔ رسول ﷺ نے ان دونوں کو مراسلہ بھیجا تھا جس پر انہوں نے اسلام قبول کر لیا اور رسول اللہ نے ان کے علاقے پر عمرو بن العاص کو عامل مقرر کیا ہے۔ ۱۹

ایک اور حکومت جو ولادت نبوی ﷺ سے کچھ پہلے ہی (امراء القیس کے دور حکومت کے بعد ۲۱) چھٹی صدی عیسوی کے وسط میں پارہ پارہ ہو چکی تھی "دولت کندہ" تھی انکا اصل وطن تو غالباً یمن کے مشرقی حصہ میں تھا ابتداء میں یہ بنو حمیر کے ساتھ ملک و حکومت میں شریک تھے لیکن بعد میں زمام حکومت صرف حمیر کے قبضہ میں آگئی تو یہاں کے ماتحت رہا۔

علاقہ حضر موت میں خاندان حضر موت کے یہاں حکومت ریاست عہد اسلام تک قائم رہی۔ ان میں سے وائل بن حجر ۱۹ ہیں جنکو رسول اللہ ﷺ سے شرف ملاقات حاصل ہوا۔ یہی حضر موت چونکہ بحر عرب کے ساحل پر آباد تھے جو تقریباً جنوبی ہندوستان کے سامنے ہے۔ اسلئے ہندوستان کی بحری تجارت کے یہ عہد قدیم سے مالک تھے، جہاز رانی میں ان کو خاص دستگاہ حاصل تھی۔ اسلام کے بعد انکی یہ قوت اور زیادہ نمایاں ہو کر چمکی۔ جزائر ہند، جاوہ، سماٹرا، اور تمام سواحل ہند میں انکی نوآبادیاں قائم ہوئیں۔ دکن کی فوجی طاقت میں حیدرآباد اور مرہٹوں کے زمانے تک انکا عنصر ایک اہم جز تھا۔ ان سواحل و جزائر میں اشاعت اسلام کی خدمت بھی انہیں حضر موتی عربوں کے ہاتھوں سے انجام پائی ہے۔ ۱۹

غرضیکہ یمن کی تاریخ انتہائی طویل اور قدیم ہے۔ یہ علاقہ بڑی بڑی تہذیبوں کا گہوارہ اور حکومت و سیاست کا مدت دراز تک مرکز رہا ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف سلطنتیں یہاں قائم ہوتی رہیں۔ ان میں جن اور قدیم ترین حکومتوں کے شواہد دستیاب ہو سکے ہیں انہیں سبائی۔ معینی اور حمیری ہیں۔ جوف یمن میں معین نامی ایک آبادی تھی۔ جس کے مشرق میں حضرموت اور جنوب مغرب میں سبا (موجودہ صنعاء) واقع تھا۔ اسکا وجود دوسری صدی ہجری تک باقی رہا۔ یہ شہر کسی زمانے میں حکومت کا مستقر تھا۔ عہد حکومت (۱۲۰۰ ق م تا ۶۵۰ ق م) تک رہا ہے۔ معین کی حکومت یمن سے شروع ہو کر شام و مصر اور اشوریا (اسیریا) تک قائم تھی۔ معین تاجر پیشہ قوم تھی۔ زیادہ تر خوشبودار لکڑی اور بخورات کی تجارت کرتی تھی۔ یمن کے علاوہ معین کے آثار حجاز و ان کے صوبے شمالی عرب میں العلاء میں بھی ملتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ معین کی کوئی نوآبادی بھی یہاں قائم تھی غالباً اس نوآبادی کی غرض یہ ہوگی کہ معین ان تجارتی راستوں کی حفاظت کرے جو سواحل بحر احمر پر عقبہ (ایلہ) ہو کر شام و فلسطین اور اسکندریہ کو جاتے تھے۔ معین کے ان آثار سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ صرف تجارتی حکومت نہ تھی بلکہ جنگ و فتح میں حصہ لیتی تھی۔ ۲۰

معین کے بعد قوم سبا نے یمن میں اپنی حکومت قائم کی۔ اور (عراق) سے جو کتبات برآمد ہوئے ان میں ڈھائی ہزار سال قبل مسیح اس قوم کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن انکے عروج کا زمانہ گیارہویں صدی قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ سبا کا اصلی مرکز حکومت عرب میں یمن کا مشرقی حصہ تھا۔ ۶۵۰ ق م سے پہلے شاہان سبا کا لقب مکرب سبا تھا۔ انکا پایہ تخت صرواح تھا۔ اس دور میں مآرب کے مشہور بند کی بنیاد رکھی گئی جسے یمن کی تاریخ میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ ۲۱ اس دور میں سلطنت سبا کو اسقدر عروج حاصل ہوا کہ انہوں نے عرب کے اندر اور عرب کے باہر جگہ اپنی نوآبادیاں قائم کر لیں۔ کیونکہ یہ ایک تاجر قوم تھی اس لیے بہت سے بحری اور تجارتی راستوں پر بھی اسکو قبضہ کرنا پڑا تھا۔ اس سلسلہ میں شمالی عرب، افریقہ حبشہ میں ازینہ کا ضلع انکے ماتحت تھا۔

۶۵۰ ق م سے ۱۱۵ ق م تک کے دور میں سبا کے بادشاہوں نے مکرب کا لفظ چھوڑ کر ملک (بادشاہ) کا لقب اختیار کر لیا۔ اور صرواح کے بجائے مآرب کو اپنا دار السلطنت بنایا۔ ۱۱۵ ق م سے ۳۰۰ عیسوی تک پورے دور میں سبا کی مملکت پر قبیلہ حمیر کو غلبہ حاصل رہا۔ اور اس نے مآرب کے بجائے ریدان کو اپنا پایہ تخت بنایا۔

حمیر کی مدت حکومت ۱۱۵ ق م سے ۵۲۵ عیسوی تک ہے۔ حمیر کا آخری بادشاہ ذونواس ۲۲ تھا۔ اس نے یہودی مذہب قبول کر لیا۔ یہ یہودیت کے تعصب میں دیوانہ ہو گیا تھا۔ اس نے نجران کا محاصرہ کر کے شہر فتح کیا۔

اس نے اپنے دورِ حکومت میں بڑے بڑے گڑھوں میں آگ دہکائی۔ اور ایک ایک کرکے عیسائیوں کو بلوایا جس نے بھی یہودیت قبول کرنے سے انکار کیا اسکو نذرِ آتش کر دیا۔ اس واقعہ کو قرآن میں "اصحاب الاخدود ۲۳" کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

ذونواس کی اس ظالمانہ حرکت پر دوس بن ثعلبان نامی ایک عیسائی امیر نے نجاشی سے مدد کی فریاد کی۔ نجاشی نے قیصرِ روم کے اشارہ سے یمن پر فوج کشی کے لیے اَرباط کو بھیجا جس نے ۵۲۵ء میں یمن فتح کر لیا۔ اَرباط نے یمن پر بیس برس حکمرانی کی۔ اس اثنا میں حبشی فوج نے بغاوت کی، ابرہہ اشرم۲۴ ایک حبشی سردار تھا اس نے اَرباط کے خلاف اس بغاوت کی قیادت کرتے ہوئے اَرباط کو قتل کرکے یمن کی حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اسلامی اقتدار قائم ہونے سے پہلے یمن، عرب اور اسکے نواحی علاقے ایرانی حکومت کے باجگذار تھے۔ ۲۵

بہر حال ملوکیت اور بادشاہی کا رواج عرب کے کئی علاقوں میں زمانہ قدیم سے موجود رہا تھا اور آمدِ اسلام کے وقت بھی یہ بادشاہتیں اور حکومتیں کسی نہ کسی شکل میں موجود تھیں۔ اس کے علاوہ طرزِ امارت بھی عرب کے مختلف حصوں میں مکمل یا نامکمل صورت میں موجود تھی۔ یعنی وہ روسائے قبائل جو اپنے اپنے قبیلوں کے امیر تسلیم کیے جاتے تھے اور انہوں نے کہیں کہیں کسی حد تک اپنی خود مختار اور آزادانہ چھوٹی چھوٹی شہری مملکتیں قائم کر رکھی تھیں۔ ان میں مکہ۔ مدینہ۔ طائف۔ جرش۔ عدن۔ صحار۔ دبی۔ ایلہ۔ دومۃ الجندل۔ فدک۔ یمامہ اور مشرقی ساحل پر اچھی خاصی بستیاں تھیں جو کم و بیش شہری مملکتیں کہی جا سکتی ہیں۔ ان تمام شہری مملکتوں میں مشہور و معروف مکہ کی شہری ریاست تھی۔ جیسے حضورﷺ کے جدِ امجد قصی ۲۷ بن کلاب نے مکہ پر قبضہ کرکے ۴۴۰ء میں قائم کیا تھا۔

مکہ حجاز کا مشہور شہر ہے۔ اسکا اصل اور قدیم نام ۲۸ "بکہ" ہے۔ قرآن مجید میں بھی یہی نام آیا ہے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا

"پہلا متبرک گھر جو آدمیوں کے لیے بنایا گیا وہ بکہ میں تھا"۔ (سورہ آل عمران: ۱۰)

مکہ کا تیسرا نام ام القریٰ (یعنی قریوں کی ماں) بھی ہے۔

و كذالك اوحينا اليك قرآنا عربيا لتنذر ام القرى و من حولها

اور یونہی ہم نے وحی کے ذریعہ اتارا آپ کی طرف قرآن عربی زبان میں تاکہ آپ ڈرائیں اہل مکہ کو اور جو اس کے آس پاس آباد ہیں۔ (الشوریٰ: ۷)

اس زمانے میں مکہ اہم تجارتی شاہراہ پر واقع تھا۔ اور تجارت کے لیے شام، یمن، طائف اور نجد جانے والے کاروانوں کے لیے جنکشن کی حیثیت رکھتا تھا۔ مکہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے سے اہمیت ملنی شروع ہوئی یہاں وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ چشمہ زمزم جاری ہونے کے بعد یہ ایک گنجان آباد شہر بن گیا۔ عرب مولف لکھتے ہیں کہ اس زمانے میں گھنے جنگل، اچھی چراگاہیں اس وادی میں پائی جاتی تھیں جہاں اب مکہ موجود ہے قصی نے یہ جنگل صاف کروا کر اپنے قبیلے کے لوگوں کے لیے کعبہ کے اطراف میں جگہ فراہم کی۔ اسکے

علاوہ ہر طرف بلند اور ناقابلِ تسخیر پہاڑوں نے اسے جنگی نقطہ نظر سے بھی محفوظ بنا دیا تھا۔ ۲۹ مکہ دو حصوں میں بنا ہوا تھا اور آج بھی ہے۔ جہاں کعبہ تعمیر ہے اسے بکہ کہتے ہیں، جبکہ پوری وادی کو مکہ کہتے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

و هو الذى كف ايديهم عنكم و ايديكم عنهم ببطن مكة

"اور اللہ وہی ہے جس نے روک دیے تھے ان کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو ان سے وادی مکہ میں"

(سورہ فتح: ۲۴)

کعبہ کی تعمیر حضرت ابراہیم اور انکے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذریعے انجام پائی۔ کعبہ کی تعمیر کے بعد مکہ کو اہمیت ملنی شروع ہوئی۔ خانہ کعبہ بغیر چھت اور دروازے کے تھا۔ اسکے چاروں طرف دیواریں کھڑی کر دی گئی تھیں۔ اسکے ایک کنارے پر حجرِ اسود لگا ہوا تھا۔ ۳۰ یہاں آلِ اسماعیل علیہ السلام ۳۱ آباد تھے۔ خاندان بنو اسماعیل میں ایک شخص عدنان گذرے ہیں جنکا زمانہ پہلی صدی ق م کے لگ بھگ ہے۔ انہوں نے قبیلہ بنو جرہم میں شادی کرکے مکہ میں رہائش اختیار کی۔ انہی عدنان کے بیٹے معد نے بھی اپنے والد کی طرح بنو جرہم کی لڑکی معانہ سے شادی کی جن سے نزار پیدا ہوئے۔ معد کے جانشین فہر تھے جنکا لقب "قریش" ۳۲ اور جنہوں نے تیسری صدی عیسوی کا زمانہ پایا۔

اس طرح عدنانی قبائل نے حجاز میں پھیلنا شروع کیا ان کی آپس میں شادیاں ہوئیں۔ کعبہ کی تولیت جو آلِ اسماعیل علیہ السلام کا موروثی حق تھی۔ اہل بابل کے حملے کے بعد پہلی صدی عیسوی میں بنو جرہم کے پاس چلی گئی۔ یہ دو ہزار سال مکہ پر حکمران رہے۔ دوسری صدی عیسوی کے وسط میں قبیلہ بنو خزاعہ جو شمالی عرب کی طرف جا رہا تھا۔ یہاں کی ہریالی اور سیاسی حالات دیکھ کر ٹھہر گیا اور موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مکہ اور حجاز کے جنوبی حصہ پر قبضہ کرکے بنو جرہم کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ بعد میں اس بنو خزاعہ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص عمرو بن لحی ۳۳ (جسکا اصل نام ربیعہ بن حارث تھا) نے کعبہ کی تولیت حاصل کر لی۔ اسطرح بنو خزاعہ کا اقتدار مکہ پر تین سو سال تک قائم رہا۔

اس دوران بنی اسماعیل جنہوں نے بنی جرہم کے ہاتھوں بڑی اذیتیں سہی تھیں۔ دوبارہ آہستہ آہستہ طاقت و قوت حاصل کرتے گئے۔ اس پورے عرصے میں عدنانی قبائل کا اقتدار میں کوئی حصہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ قصی کا ظہور ہوا۔ اس نے مکہ کی تاریخ کا رخ بدل دیا۔ اس نے بنو خزاعہ کے آخری حکمران حلیل بن حبشیہ خزاعی کی صاحبزادی حبی سے شادی کر لی اور ایک جنگ کے بعد کعبہ کی تولیت پر قبضہ کر لیا۔ ۳۴

مکہ پر اپنی حکومت قائم کرنے کے بعد قصی نے قبائل قریش میں جو کہ مختلف حصوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اتحاد پیدا کیا۔ اور آپس میں مشورہ کرکے انہیں اطراف کعبہ میں آباد کیا۔ جسکی وجہ سے اسکو قریش اول اور "مجمع" ۳۵ کا نام دیا گیا۔ اسکے بعد قصی نے مکہ کے سیاسی حالات کو منظم رکھنے کے لیے ایک دارالندوہ قائم کرکے

اسکے مختلف محکمے ترتیب دیئے۔ جنکی تعداد تقریباً ۱۰ تھی۔ بعد میں ان شعبوں میں اضافہ ہوتا رہا یہ تقریباً ۲۱ تھے۔

۱۔ حجابہ (خانہ کعبہ کی دربانی)
۲۔ سقایہ (حاجیوں کو پانی پلانا)
۳۔ رفادہ (حاجیوں کے لئے کھانے کا انتظام اور مال کا بندوبست)
۴۔ لواء (جھنڈا، جنگی عہدہ)
۵۔ ندوہ (شوریٰ)
۶۔ مشورہ (امور اہم میں مشورہ)
۷۔ قیادہ (جنگ میں لشکر کی قیادت)
۸۔ قبہ (شامیانہ فوجی معسکر کا انتظام)
۹۔ اعنہ (گھوڑے کی لگام۔ سواروں کے رسالے کی سپہ سالاری)
۱۰۔ اموال المحجرہ (بت خانے کا مال)
۱۱۔ ایسار والازلام (بتوں سے استخارہ)
۱۲۔ اشناق (خون بہا۔ جرمانے اور مال تاوان۔ دیت کا انتظام)
۱۳۔ حکومت (مقدمات کا فیصلہ)
۱۴۔ سفارہ (سفارت)
۱۵۔ عقاب (جھنڈا۔ جنگ کے وقت نشان قومی کی علمبرداری)
۱۶۔ سدانہ (کعبہ کی دربانی۔ کلید برداری اور کھولنا)
۱۷۔ اعتافہ
۱۸۔ اجازہ
۱۹۔ نسئی (مہینے بدل دینا)
۲۰۔ حلوان النفر (بدلے میں دوسرا فوجی بھیج دینا۔ جنگی عہدہ)
۲۱۔ عمارۃ البیت (حرم کعبہ میں اخلاقی محاسن کی نگرانی)

دار الندوہ قریش کا منعقد اعلیٰ اجتماع بھی کہتا تھا۔ مکہ کی سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تہذیبی و ثقافتی زندگی میں اس نے انتہائی موثر کردار ادا کیا۔ قریش کے تمام معاملات ندوہ میں طے پاتے تھے۔ جنگ، صلح، انتظامی امور اور دیگر پیش آمدہ معاملات و مشورہ اس عمارت میں ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ نکاح و بلوغ کا اعلان بھی ندوہ سے ہوتا تھا۔ ۳۷ اس نے جو شعبے قائم کئے وہ تمام قریش کی مختلف شاخوں میں تقسیم تھے۔ بعثت نبوی کے وقت کل چودہ عہدے باقی تھے۔ جو دس مختلف قبائل میں تقسیم تھے۔

سقایہ (بنی ہاشم)۔ رفادہ (بنی نوفل)۔ لواء۔ ندوہ اور سدانہ و حجابہ (بنی عبدالدار)۔ مشورہ (بنو اسد)۔ عقاب (بنو امیہ)۔ اموال المحجرہ اور حکومت (بنو سہم)۔ ایسار والازلام (بنو جمح)۔ اشناق (بنو تیم)۔ قبہ اور اعنہ (بنی مخزوم) اور سفارت کے عہدے بنو عدی کے پاس تھے ہر قبیلہ اپنے طور پر اپنے متعلقہ انتظامی شعبہ کا ذمہ دار تھا۔ ان قبیلوں نے جس انتظامی حسن کارکردگی کا ثبوت دیا اسکے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہل مکہ انتظام ریاست کا بڑی حد تک سلیقہ رکھتے تھے۔

قصی نے بڑے یادگار رفاہی کام انجام دیئے تھے اس نے قریش کو ایک ٹیکس (رفادہ) دینے پر آمادہ کیا کہ وہ زائرین جو بڑی دور سے زیارت کعبہ کے لیے آتے ہیں ان کی میزبانی قریش کا فرض ہے۔ چنانچہ اس نے ایک سالانہ ٹیکس مقرر کر دیا جس سے منیٰ و مکہ معظمہ کے حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا یہ خدام حرم کا سب سے بڑا مذہبی منصب تھا۔ قصی نے اس وقت تک حجاج کو پانی پلانے اور کھانا کھلانا لازم قرار دیا جب تک وہ اپنے مذہبی امور ادا کر کے مکہ سے رخصت نہیں ہو جاتے اس کے علاوہ مزدلفہ میں قیام کے وقت آگ روشن کرنے کی رسم بھی نکالی۔ یہ آگ شب اجتماع عرفات میں روشن رہا کرتی تھی تاکہ عرفات آنے والا اس روشنی سے رہنمائی حاصل کر سکے۔
اسکے علاوہ چرمی حوض بنوائے تاکہ زائرین ایام حج میں انہیں بھرے ہوئے پانی سے استفادہ کر سکیں۔

حجابہ کا عہدہ خود قصی کے پاس تھا۔ خانہ کعبہ کا دروازہ قصی خود کھولتا تھا۔ سقایہ کے تحت زمزم کے مقدس کنوؤں کا اور اسکے پانی کا اجارہ جو حجاج کرام کے استعمال کے لیے مخصوص تھا۔ بنی ہاشم کے پاس تھا۔ حج کے دنوں میں کنوؤں کے پانی میں کھجور اور کشمش ڈال کر میٹھا کر دیا جاتا تھا۔ فتح مکہ کے وقت یہ عہدہ حضور ﷺ کے چچا حضرت عباس کے پاس تھا۔ قصی کے ان اقدامات سے اسے بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ ۳۸

یہ سارے مناصب قصی کی زندگی میں اسکو حاصل تھے اس لیے قصی نے اپنے بڑے بیٹے عبدالدار کو جو کہ اس کے دوسرے بیٹے عبد مناف سے شرف و سیادت میں کم تر تھا۔ بلند تر مقام پر پہنچانے کے لیے ان سارے مناصب اور اعزازات کی وصیت اسکے نام کر دی۔ یعنی دار الندوہ کی ریاست۔ خانہ کعبہ کی حجابت۔ لواء۔ سقایہ اور رفادہ سب کچھ عبدالدار کو دے دیا۔ قصی کا حکم اسکی زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی قریش کے لیے مذہبی حکم کا درجہ رکھتا تھا چنانچہ اسکی وفات کے بعد اسکے بیٹوں نے کسی نزاع کے بغیر اسکی وصیت قائم رکھی۔ لیکن جب عبد مناف کی وفات ہوگئی تو اسکے بیٹوں کا ان مناصب کے سلسلے میں اپنے چچیرے بھائیوں یعنی عبدالدار کی اولاد سے جھگڑا ہوا اسکے نتیجہ میں قریش دو گروہ میں بٹ گئے۔ عہدوں کے حصول کے لیے آپس میں جنگ بھی ہو سکتی تھی لیکن دوسروں نے بیچ میں پڑ کر صلح کروا دی اور یہ مناصب باہم تقسیم کر لیے گئے۔ چنانچہ سقایت اور رفادہ کے مناصب بنو عبد مناف اور دار الندوہ کی سربراہی اور حجابت بنو عبدالدار کو مل گئی۔ ۳۹ پھر عبد مناف نے اپنے درمیان حاصل شدہ مناصب کے لیے قرعہ ڈالا تو قرعہ ہاشم بن عبد مناف کے نام نکلا چنانچہ ہاشم ہی نے زندگی بھر سقایہ و رفادہ کا انتظام کیا۔ یہ حجاج کو پیٹ بھر کر کھانا کھلاتے تھے۔ چرمی حوضوں میں پانی بھروا کر زمزم اور منیٰ کے پاس سبیل رکھتے

تھے۔ ایک دفعہ مکہ میں سخت قحط پڑا ہاشم شام گئے وہاں سے آٹا خریدا۔ یہ سامان حج تک مکہ لے آئے۔ پھر روٹیاں تیار کروا کر ٹکڑے کئے۔ اونٹ ذبح کر کے ثرید تیار کیا (روٹی کو شوربے میں چورہ کرنے) اور لوگوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ اس سے ان کو بڑی عزت وتکریم حاصل ہوئی۔ یہاں سے انکا نام ہاشم مشہور ہوا جبکہ اصل نام عمرو تھا۔ عربی زبان میں چورہ کرنے کو ہشم کہتے ہیں جسکا اسم فاعل ہاشم ہے۔

آہستہ آہستہ تمام سیاسی اختیارات بھی انہیں حاصل ہو گئے۔ ہاشم ذہین انسان تھے مکہ کے مشہور تاجروں میں آپ کا شمار کیا جاتا تھا۔ انہوں نے قیصر روم اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی سے تجارتی معاہدے کئے کہ قریش جب ان کے ملک میں اسباب تجارت لیکر جائیں تو ان سے کوئی ٹیکس نہ لیا جائے۔

اسکے علاوہ ہاشم نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ قریش کے تجارتی قافلوں کو سال میں دو دفعہ تجارت کے لئے جانا چاہیے۔ چنانچہ اہل عرب سردیوں میں یمن اور گرمیوں میں شام اور ایشیائے کوچک تک تجارت کے لئے جایا کرتے تھے۔

اس زمانے میں عرب میں راستے محفوظ نہ تھے۔ ہاشم نے مختلف قبائل کا دورہ کر کے قبائل سے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو ضرر نہ پہنچائیں گے، جس کے صلے میں کاروان قریش ان قبائل میں ان کی ضرورت کی چیزیں خود لے کر جائیگا۔ اور ان سے خرید وفروخت کرے گا۔ یہی سبب تھا کہ عرب میں عام لوٹ مار کے قریش کا قافلہ تجارت ہمیشہ محفوظ رہتا تھا۔[۲۱]

ہاشم ایک بار تجارت کی غرض سے شام گئے۔ راستے میں مدینہ میں ٹھہرے یہاں انہوں نے خاندان بنی نجار کی خاتون سلمٰی بنت عمرو سے شادی کی۔ شادی کے بعد یہ شام چلے گئے اور غزہ میں جا کر انتقال کیا۔ ہاشم کی وفات کے بعد سرداری ان کے بھائی مطلب کو ملی اور مطلب کی وفات کے بعد سردار ہاشم کے بیٹے عبدالمطلب بنے۔ ان کا اصلی نام ان کے سفید بالوں کی وجہ سے شیبہ رکھا گیا تھا۔ عبدالمطلب اپنے والد ہاشم کی وفات کے بعد پیدا ہوئے۔ تقریباً ۸ سال مدینہ میں پرورش پائی۔ جب مطلب کو ان کے حالات کا علم ہوا تو وہ عبدالمطلب کو اپنے ساتھ مکہ لے آئے۔ یہ واپسی میں مطلب کیساتھ انکے پیچھے اونٹ پر بیٹھے ہوئے تھے یہ دیکھ کر لوگوں نے انہیں عبدالمطلب یعنی مطلب کا غلام کہنا شروع کر دیا۔ بعد میں یہ اسی نام سے مشہور ہوئے۔[۲۲]

عبدالمطلب مکہ کے معزز ترین اشخاص میں شمار کئے جاتے تھے۔ اس زمانے میں یمن کا گورنر ابرہہ صباح حبشی تھا۔ اس نے کعبہ کی شان وشوکت دیکھ کر یمن (صنعا) میں ایک کلیسا تعمیر کروایا تا کہ لوگ خانہ کعبہ کو چھوڑ کر اس کا طواف کریں۔ لیکن جب بنو کنانہ کے ایک آدمی کو اسکی خبر ہوئی تو اس نے ایک رات کلیسا میں گھس کر اس پر غلاظت پھینک دی۔ اسپر ابرہہ کو سخت غصہ آیا اور یہ خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اسکے لشکر میں کچھ فیل (فیل عربی زبان میں ہاتھی کو کہتے ہیں) بھی شامل تھے۔ مکہ کے لوگوں کو جب اسکے ارادہ کا علم ہوا تو وہ سب اور عبدالمطلب اپنے اونٹ لے کر پہاڑوں پر چلے گئے۔ عبدالمطلب نے کہا کہ "میں اپنے اونٹوں کی حفاظت کرتا

ہوں اللہ اپنے گھر کی حفاظت خود کرے گا"۔

جب ابرہہ وادی مُحَسِّر (مزدلفہ و منٰی کے درمیان وادی ہے) پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے ابابیل کے ذریعہ ان پر کنکر برسائے جن پر نشان تھے اسطرح ابرہہ کا لشکر ختم ہو گیا۔ انکے بعد مکہ کے لوگوں کو پہلے چیچک کی بیماری کا علم ہوا۔[۲۳]

یہ واقعہ مکہ کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس تاریخ سے مکہ کی باقاعدہ اور مستقل تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ کیونکہ قریش قصی بن کلاب کی عظمت و مرتبہ کی بناء پر اس کی وفات کے دن سے سالوں کی تاریخ کا تعین کرتے تھے مگر اس سے زیادہ اہم "واقعہ فیل" [۲۴] کے بعد اس دن سے سالوں کی تاریخ مرتب کی جانے لگی۔ اس سال حضور ﷺ کی پیدائش ہوئی یعنی ہاتھیوں والے سال جسے عام الفیل کہا جاتا ہے۔

مندرجہ بالا بحث سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ شہر روما میں ہی نہیں بلکہ ایتھنز کی شہری ریاست کے وجود میں آنے سے بھی پہلے جنوبی عرب خصوصاً یمن میں ایک ریاست موجود تھی۔ اس اعتبار سے عرب کا تمدن یورپ کے تمدن سے بھی زیادہ قدیم ہے۔[۲۵]

ڈاکٹر محمد حمید اللہ اپنی کتاب "عہد نبوی میں نظام حکمرانی" میں بجا طور پر قمطراز ہیں کہ آغاز اسلام کے وقت پورے جزیرہ عرب میں ایک معاشی وفاق بھی قائم ہو چکا تھا جسکا باعث وہاں کے سالانہ میلے [۲۶] (اسواق العرب) اور وہاں کے کاروانوں کا نہایت ترقی یافتہ انتظام خفارہ (بدرقہ) تھے۔ بظاہر یہ معاشی وفاق نیز یہ واقعہ کہ پورے ملک میں ایک ہی بولی جاتی تھی، ایک ہی طرح سے وہ فال دیکھا کرتے تھے، مختلف بتوں یا دیوتاؤں کو وہ مشترکہ طور پر مانتے تھے، اور بڑی حد تک ان کے رسم ورواج بھی یکساں ہی تھے۔ اسلئے ان چیزوں نے سیاسی اتحاد کیلئے بہت کچھ زمین ہموار کر دی۔ اور جب اسلام آیا تو اس نے جزیرہ نمائے عرب کے نراج میں بڑی تیزی سے ایک مرکزیت پیدا کر دی۔

حواشی وحوالہ جات

۱۔ نعمانی، شبلی۔ سیرت النبی، جلد اول، پروفیسر نولڈیکی، مورخین کی تاریخ عالم، جلد ۸۔

۲۔ عرب کی آبادی دو حصوں میں تقسیم تھی حضری اور بدوی۔ حضری شہروں میں رہنے والوں کو اور صحراؤں میں بسنے والوں کو خانہ بدوش یا بدوی کہا جاتا تھا۔ تفصیلات کیلئے دیکھیے: آلوسی، محمود شکری آلوسی۔ بلوغ الارب، طبع دارالکتاب المصری، مصر طبع سوم، جلد اول ص ۱۳ تا ۱۵۔ نیز بلگرامی، سید علی۔ تمدن عرب، مطبع محمود ریاض پرنٹرز، لاہور ص ۱۵۵ تا ۱۵۷۔

۳۔ عرب کے سب سے قدیم سامی قبائل حضرت نوح کے بیٹے سام کی نسل سے ہیں۔ یہاں کے سب سے پہلے اور

ابتدائی باشندے تھے اور مختلف وجوہ سے یہاں سے نکل کر بابل، مصر اور شام وغیرہ میں پھیل گئے۔ (ندوی، سید سلیمان۔ ارض القرآن، مطبع معارف اعظم گڈھ، جلد اول، طبع دوم ۱۳۴۲ھ، ص ۱۲۵۔

۴۔ نقوش رسول نمبر، جلد ۵۔ ڈاکٹر نثار احمد، بعثت نبوی کے وقت عرب کا سیاسی نظام۔

۵۔ عرب مورخین کے نزدیک امم بائدہ (برباد ہو جانے والے قبائل) سے ہیں یہ عرب کے خالص اور غیر مخلوط النسل باشندے ہیں اور ان کی جماعت کے افراد کو عاد و ثمود و طسم اور جدیس کہتے ہیں۔ ایضاً ج اول ص ۱۲۷، ۱۲۵ مطبع معارف اعظم گڑھ (نیز سورہ اعراف)

۶۔ ایضاً جلد اول، ص ۱۶۴ تا ۱۶۷۔

۷۔ ایضاً ج ۱۔ ص ۱۸۷۔ ۱۸۹۔ ۱۳۳۔ ۱۳۰

۸۔ ندوی، سید سلیمان۔ تاریخ ارض القرآن، مطبع معارف اعظم گڈھ، طبع دوم ۱۳۴۲ھ، ص ۱۳۳۔

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً جلد اول۔ ص ۱۸۹۔ ۱۸۸

۱۱۔ صالح ثمود کے پیغمبر کا نام تھا۔ جن سے پہاڑ سے اونٹنی کا بچہ نکالنے کا معجزہ منسوب ہے۔ ایضاً، جلد اول، ص ۱۹۰۔

۱۲۔ ایضاً، جلد اول، ص ۱۹۹۔ ۱۹۸

۱۳۔ عراق کے لخمی قبیلے کی دور جاہلیت کی تاریخ اچھی طرح معلوم نہیں۔ انکا نسب کچھ اسطرح ہے کہ "بنو لخم بن عدی بن الحارث بن مرہ بن اُدد بن زید بن یشجب بن عریب بن زید بن کہلان بن سبا"۔ عدی بن الحارث کے بارہ بیٹے تھے۔ الحارث اور انکی اولاد بنو عاملہ، عمرو بن عدی اور انکی اولاد بنو جزام اور مالک بن عدی یہ بنو لخم کہلائے۔ ان تینوں قبیلوں میں بنو لخم بلاشبہ ممتاز ترین ہی نہیں بلکہ قدیم ترین بھی تھا۔ اساطیر کی رو سے انکا سلسلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے جا ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب انکے بھائی کنویں میں پھینک گئے تو انہیں جس شخص نے کنویں سے نکالا وہ ایک لخمی ہی تھا۔ ہجرت نبوی سے کچھ پہلے بنو لخم کا زور ٹوٹ گیا تھا لیکن بنو عاملہ اور جزام کی اہمیت جنہوں نے بنو امیہ کے تحت کارنامے انجام دیئے بڑھ گئی تھی ہجرت نبوی سے دو صدی قبل لخمیوں کے بیشتر افراد جزیرہ نمائے عرب کے شمالی علاقوں مثلاً شام و فلسطین اور عراق میں آباد ہو گئے جہاں انہوں نے الحیرہ میں لخمی خاندان کی بنیاد ڈالی۔ جو ہمیشہ غسانیوں سے برسر پیکار رہتی تھی۔ قبیلہ جزام کی طرح انہوں نے بھی عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ ظہور اسلام کے وقت قبیلہ جزام شام کے لخمیوں کو جو ان کے رشتہ دار تھے عملاً اپنے میں جذب کر چکے تھے اور یہ عمل پرامن اور باہمی سمجھوتے سے مکمل ہوا۔ پہلی صدی ہجری میں ان دونوں قبیلوں کو عموماً ایک ہی گروہ کی حیثیت سے یاد کیا جاتا ہے۔ جزامی کے مقابلے میں نسبت لخمی شاذ و نادر ہی استعمال ہوتی تھی۔ لفظ لخمی اب عملاً ایک اعزازی لقب سے کچھ ہی زیادہ اہمیت کا حامل رہ گیا تھا۔ حقیقت میں لخم کا جزام سے علیحدہ کوئی وجود باقی نہیں رہا تھا۔ (دائرہ معارف اسلامیہ دانشگاہ پنجاب، جلد ۱۸، طبع اول ۱۹۸۵ء)

۱۴۔ قحطانی قبائل کے سلسلوں میں ایک قبیلہ بنو قران (ازد) ہے انکی اولاد میں ایک شخص مازن گذرا ہے۔ مازن کی نسل کہلاتی ہے۔ غسان ایک چشمہ کا نام ہے۔ جس کیطرف یہ لوگ منسوب کئے گئے اور اس خاندان سے بادشاہوں کا گھرانہ منوط ہے۔ (المعارف، ابن قتیبہ الدینوری، ص ۴۹۔ ۴۸)

۱۵۔ جبلہ بن ایہم بوزنطی سلطنت کا حلیف تھا، لہذا اس نے مسلمانوں سے دو جنگیں (دومۃ الجندل اور یرموک لڑیں اور شکستیں کھائیں۔ یہ اسلامی نظریہ مساوات کی سختیوں کی تاب نہ لا کر مرتد ہو کر عیسائی ہو گیا تھا (نیز مزید تفصیل کے لیے دیکھئے دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۷، مطبع دانشگاہ پنجاب، طبع اول ۱۳۹۱ھ/۱۹۷۱ء۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۲ کا مضمون اسلام۔ طبع اول ۱۹۸۰ء)

۱۶۔ نقوش رسول نمبر ج ۵، ص ۳۵ مضمون نگار ڈاکٹر نثار احمد، بعثت نبوی کے وقت دنیا کا سیاسی نظام۔

۱۷۔ چھٹی صدی عیسوی کا ایک مشہور عرب شاعر ہے کہا جاتا ہے کہ امرؤ القیس سب سے پہلے شخص ہے جس نے عربی شاعری میں باقاعدہ فن قصیدہ کی بنیاد رکھی اور قافیے کے اصول متعین کئے۔ اس نے عربی شاعری میں جان ڈالدی۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ "امرؤ القیس شاعری کا زبردست ملکہ رکھتا تھا وہ فطری شاعر تھا۔ اس نے اپنے اشعار میں بعض ایسے مضامین بیان کئے ہیں جنکا پہلے رواج نہ تھا۔ اسکے اسالیب بیان پر نظر ڈالیں گے تو دیکھیں گے کہ وسعت معلومات اور بکثرت سفروں کا نتیجہ ہیں۔ (دائرہ معارف اسلامیہ، جلد ۳، مطبع دانشگاہ پنجاب، طبع اول ۱۹۶۸ء)۔

۱۸۔ عہد اسلام میں حضرموت کا آخری بادشاہ حضرت وائل بن حجر تھا۔ شاہان عالم کے سلسلہ میں وائل کو عربی میں خط لکھا گیا تھا، وہ حضرموتی الفاظ کی آمیزش کے ساتھ تھا۔ (تاریخ ارض القرآن، سید سلیمان ندوی، جلد ۱، ص ۲۳۵، مطبع معارف اعظم گڈھ ۱۳۴۲ھ)۔

۱۹۔ ایضاً، جلد ۱، ص ۲۳۳، طبع دوم ۱۳۴۲ھ۔

۲۰۔ ایضاً، جلد ۱، ص ۲۱۵ تا ۲۱۷۔

۲۱۔ عرب کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں ہے۔ پانی پہاڑوں سے بہہ کر ریگستانوں میں خشک ہو جاتا ہے۔ سبا کے لوگ مختلف مناسب موقعوں پر پہاڑوں اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند (سد) باندھ دیتے تھے کہ پانی رک جائے اور زراعت کے مصرف میں آئے۔ مملکت سبا میں اس قسم کے سینکڑوں بند تھے انمیں سب سے مشہور بند "سد مآرب" تھا۔ دو پہاڑوں کے بیچ (کوہ ابلق) میں تقریباً ۸۰۰ ق م میں یہ بند تعمیر ہوا۔ جو کہ ۱۵۰ فیٹ لمبا اور ۵۰ فٹ چوڑا تھا۔ (ندوی، سید سلیمان۔ تاریخ ارض القرآن۔ ج اول۔ مطبع معارف اعظم گڑھ طبع دوم ۱۳۴۲ھ، ص ۲۵۵۔ ۲۵۴)۔

۲۲۔ الدینوری نے لکھا ہے کہ اسکا نام ذونواس اس لیے پڑا کہ اسکے ماتھے پر بالوں کی ایک لٹ لہراتی تھی۔ مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ: زیادہ تر روایات کی رو سے صرف ذونواس ہی اکیلا یہودی بادشاہ ہوا۔ اور جب اس نے

مذہب تبدیل کیا تھا تو اس نے اپنا نام یوسف (Joseph) رکھا، جبکہ بعض مآخذ اور روایات اسے (Phineas) کے نام سے موسوم کرتے ہیں (نقوش رسول نمبر ﷺ۔ ج ۵، مضمون نگار ڈاکٹر پروفیسر نثار احمد۔ بعثت نبوی کے وقت دنیا کا سیاسی نظام)۔

۲۳۔ المسعودی، ابوالحسن علی بن حسین بن علی، مروج الذہب و معادن الجوہر، طبع بیروت ۱۹۶۵ء، جلد اول، ص ۸۰۔۸۱

۲۴۔ ابرہہ، لفظ ابراہیم کا حبشی تلفظ ہے، نکٹا تھا اسلیئے اشرم کہلاتا تھا۔ یہ مذہباً عیسائی اور رومی غلام تھا، بعد میں شاہ حبش یلا اصحمہ کے خلاف جس فوج نے بغاوت کی تھی اسکا سردار بن گیا۔ (ندوی، سید سلیمان۔ تاریخ ارض القرآن، مطبع معارف، اعظم گڈھ، طبع دوم ۱۳۴۲ھ، جلد اول، ص ۳۱۷ تا ۳۱۹)۔

۲۵۔ ابن ہشام المعافری، ابی محمد عبد الملک، السیرت النبویہ لابن ہشام، مطبع الکلیات الازہریہ، جلد اول، ص ۵۵ تا ۵۷۔

۲۶۔ قصی کا اصل نام زید تھا، قصی کے معنی دور رہنے کے ہیں کیونکہ ان کے والد ہاشم کا انتقال اس وقت ہوا جب یہ چھوٹے تھے لہٰذا ان کی والدہ فاطمہ نے بنو عذرہ کے ایک شخص ربیعہ بن حرام سے شادی کر لی اور شام چلی گئیں، ساتھ قصی کو بھی لے گئیں۔ جوان ہونے تک یہ اپنے عزیز و اقارب و وطن سے دور رہے، جوان ہونے کے بعد مکہ واپس آئے جسکی وجہ سے انہیں قصی کہا جاتا ہے۔ (ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، طبع دار صادر بیروت، لبنان، جلد اول، ص ۶۷)۔

۲۷۔ نعمانی، شبلی، سیرت النبی، طبع معارف، اعظم گڈھ، طبع چہارم، جلد اول، ص ۱۳۹۔

۲۸۔ حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، طبع مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن، طبع دوم، جلد اول، ص ۲۲۔۲۱

۲۹۔ ایضاً، ص ۲۴ تا ۲۵

۳۰۔ نعمانی، شبلی۔ سیرت النبی، مطبع معارف، اعظم گڈھ، طبع چہارم، جلد اول، ص ۱۵۵۔

۳۱۔ حضرت ابراہیم، اسماعیل اور ان کی والدہ ہاجرہ کو مکہ لائے اور انہیں وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ اس اثناء میں قبیلہ جرہم کے کچھ لوگ آ کر مکہ کی گھاٹیوں میں بس گئے۔ حضرت اسماعیل بنو جرہم کے بچوں کے ساتھ پلے بڑھے، تیر اندازی سیکھی اور انہیں کی زبان بولنے لگے۔ قبیلہ جرہم کے شخص مضاض بن عمرو کی بیٹی سے شادی کی جن سے حضرت اسماعیل کے بارہ بیٹے پیدا ہوئے۔ انمیں قیدار اور نبت تھے۔ نبت حضرت اسماعیل کا بڑا بیٹا تھا۔ اور اپنے باپ کے بعد وہی خانہ کعبہ (بیت اللہ) کا متولی ہوا اور اس کے بعد اسکا نانا مضاض بن عمرو جرہمی متولی ہوا۔ جب حضرت اسماعیل کی اولاد تعداد میں بڑھی تو مکہ کی سرزمین ان کے لیے تنگ اور ناکافی ہو گئی اور وہ مختلف بستیوں میں پھیل گئے، وہ جس علاقے میں جاتے اللہ انہیں وہاں کے لوگوں پر غالب و فتح مند کر دیتا تھا۔ انہیں نے "عمالقہ" کو شکست دے کر نکال دیا تھا۔ (ابن قتیبہ، الدینوری، محمد عبد اللہ بن مسلم، المعارف، طبع قدیمی کتب خانہ آرام باغ،

کراچی، ص ۱۷۔۱۹)۔ نیز ابن ہشام المعافری، ابی محمد عبد الملک، طبع الکلیات الازہریہ، جلد اول، ص ۳۲، ۲۳۱)۔

۳۲۔ فہر کا لقب قریش تھا، اس بناء پر انکی نسل نے "قریش" اپنا خاندانی علم قرار دیا۔ لفظ قریش کے عربی میں متعدد معنی ہیں۔ اسکا ایک ماخذ تقریش و تقرش ہے جسکی معنی "اکتساب و تحصیل" ہے، کیونکہ اس خاندان کا اصل پیشہ تجارت تھا اسلیئے قریش کے نام سے موسوم ہے۔ قریش ایک دریائی درندہ کا بھی نام ہے، جو دریائی جانوروں کو شکار کرتا ہے۔ فہر نے اپنے استیلاء و قوت کے اظہار کیلئے یہ لقب اختیار کیا۔ (ندوی، سید سلیمان۔ تاریخ ارض القرآن۔ ج اول۔ مطبع معارف اعظم گڈھ طبع دوم ۱۳۴۲ھ، ص ۱۰۰۔۹۹)۔

۳۳۔ نزار بن معد کے تین بیٹے تھے، جنمیں مضر کے بیٹے الیاس سے تین بیٹے پیدا ہوئے۔ مدرک، طابخہ اور قمعہ۔ قمعہ سے ایک لڑکا لحی پیدا ہوا اور لحی سے عمرو، اور عمرو سے خزاعہ۔ یہی وہ عمرو بن لحی ہے جس سے عرب میں سب سے پہلے بت پرستی کی بنیاد پڑی۔ (ابن ہشام المعافری، ابی محمد عبد الملک، طبع الکلیات الازہریہ، جلد اول، ص ۷۱، ۷۰۔۶۸)۔

۳۴۔ کعبہ کی تولیت کے حوالے سے مورخین دو تین روایتیں بیان کرتے ہیں:
۱) قصی نے حلیل کی بیٹی سے شادی کی، اسلیئے کعبہ کی تولیت حاصل کر لی۔
۲) حلیل نے وصیت کی تھی کہ میرے مرنے کے بعد کعبہ کی تولیت قصی کو دے دی جائے، لیکن بنو خزاعہ تیار نہیں ہوئے لہٰذا جنگ ہوئی اور اسکے بعد قصی نے کعبہ کی تولیت حاصل کی۔
۳) حلیل کے بعد اسکے بیٹے غبشان نے کعبہ کی تولیت شراب کے ایک مٹکے کے عوض قصی کو فروخت کر دی۔ (ایضاً، ص ۱۱۰)

۳۵۔ ابن قتیبہ، الدینوری، محمد عبد اللہ بن مسلم، المعارف، طبع قدیمی کتب خانہ آرام باغ، کراچی، ص ۳۲۸۔

۳۶۔ حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، طبع مکتبہ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن، جلد اول، ص ۳۱ تا ۳۳۔

۳۷۔ ایضاً، ص ۳۹۔۳۸

۳۸۔ ایضاً، ص ۴۹، ۳۵۔

۳۹۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ، طبع دار صادر بیروت، لبنان، جلد اول، ص ۷۵۔

۴۰۔ ایضاً، ص ۷۷۔

۴۱۔ ایضاً، ص ۷۸، ۷۶، ۷۵۔

۴۲۔ ایضاً، ۷۹۔

۴۳۔ ابن ہشام المعافری، ابی محمد عبد الملک، طبع الکلیات الازہریہ، جلد اول، ص ۳۱، ۳۷، ۳۶، ۳۳، ۳۰، ۳۷۔

۴۴۔ آلوسی، محمود شکری آلوسی۔ بلوغ الارب، طبع دار الکتاب العربی، مصر، طبع سوم، جلد اول، ص ۲۵۸ تا ۲۵۱۔

۴۵۔ حمید اللہ، محمد، ڈاکٹر۔ اسلامی ریاست عہد رسالت کے طرز عمل سے استشہاد، طبع الفیصل، غزنی اسٹریٹ،

اردو بازار، لاہور، ص ۵۱۔

۳۶۔ آلوسی، محمود شکری آلوسی۔ بلوغ الارب طبع دار الکتاب العربی، مصر، طبع سوم، جلد اول، ص ۲۶۲ تا ۲۶۷۔

عرب کے مختلف حصوں میں سال بھر میلے جاری رہتے تھے۔ سیاسی طور پر ان کی اہمیت اس لیے بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہی وہ مواقع تھے کہ جہاں ایک ہی وقت میں بہت سے قبائل جمع ہوتے تھے۔ آپس میں باہمی معاملات طے ہوتے۔ باہمی خون کے مقدمے، سرداروں کے اختلافات اور جھگڑوں کا فیصلہ یہیں کیا جاتا۔ گویا ان میلوں (مجامع) کو اس اعتبار سے ایک قسم کی بین القبائلی عدالت (Inter-Tribal Court) کہا جاسکتا ہے۔ ان میلوں کے ذریعے پورے ملک میں عملاً ایک معاشی وفاق بھی قائم ہو چکا تھا۔ یہ میلے دومۃ الجندل، شحر، صحار، دبا، عدن، صنعاء، حضرموت، عکاظ، ذوالمجاز، نجیر، منیٰ، یمامہ میں منعقد ہوتے تھے۔ ان میلوں میں چین، سندھ اور ہند کے لوگ بھی تجارتی سامان لاتے تھے۔ عکاظ کا میلہ ان تمام میلوں میں سب سے زیادہ شہرت کا حامل تھا۔ جہاں ایام حج میں برابر خرید و فروخت ہوا کرتی تھی۔

ہر اک ذرہ میں ہے شاید مکیں دل
اسی جلوت میں ہے خلوت نشیں دل
اسیر دوش و فردا ہے و لیکن
غلام گردش دوراں نہیں دل
کوئی دیکھے تو میری نے نوازی
نفس ہندی، مقام نغمہ تازی
نگہ آلودۂ انداز افرنگ
طبیعت غزنوی، قسمت ایازی

کیا جہیز دینا سُنّت ہے؟

علامہ جعفر شاہ پھلواری

عورتوں کے اسلامی حقوق

اسلام نے عورتوں کو جتنے حقوق دیے ہیں۔ ان سے زیادہ حقوق آج تک کسی مذہب، کسی قوم اور کسی مملکت نے اس ترقی یافتہ دور میں بھی نہیں دیے ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ عملی زندگی میں مسلمان قوم نے ان حقوق کا بڑا حصہ سلب کرلیا ہے اور دوسری طرف جب قوموں کے مذاہب نے عورتوں کو برائے نام حقوق دیے تھے ان قوموں نے عورتوں کو عملاً بہت کچھ حقوق دے دیے ہیں یا دے رہے ہیں۔ تارک مذہب تو مسلمان بھی ہیں اور غیر مسلم بھی۔ لیکن اسی ترک مذہب سے مسلمان نیچے گرے اور غیر مسلم آسمان عروج پر پہنچ گئے

ایک لگن کے دو ہیں اثر اور دونوں حسب مراتب ہیں
لو جو لگائے شمع کھڑی ہے رقص میں ہے پروانہ بھی

(آزاد لکھنوی)

ترک مذہب کے یہ دونوں اثرات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ ادھر ترک اسلام کے نتیجے میں رسوم کفر کی پیروی ہو رہی ہے اور ادھر ترک کفر کے ساتھ ساتھ اسلامی اصول کو اپنایا جا رہا ہے۔

؎ ... میں ہوا کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا

جہیز اور مسلمان

اس کی مثال میں ہندو دھرم اور اسلامی دین کی صرف ایک بات کو پیش کرنا کافی ہے۔ ہندو دھرم میں دختر کے لئے وراثت میں کوئی حصہ نہیں اس لیے وہ اس کی تلافی یوں کرتے رہے کہ جب بیٹی کی شادی کرتے تو جتنا کچھ اسے دے سکتے جہیز کے نام سے دے دیتے۔ مسلمان بھی یہی کچھ ان کی دیکھا دیکھی کرنے لگے۔ بہت سے خاندانوں میں بیٹی کو ترکہ نہیں ملتا۔ سارے مسلمان ایسا نہیں کرتے لیکن دوسرے حصے پر سب عمل کرتے ہیں یعنی

بیاہتے ہوئے اسے جہیز دینا اتنا ضروری سمجھتے ہیں کہ گویا اس کے بغیر شادی ہی مکمل نہیں ہوتی۔

تبدیل رسم

ذرا یہ ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ ہندو اپنے دھرمی اصولوں کو ترک کر رہے ہیں اور اس ترک کے علاوہ اسلامی اصولوں سے پیار کر رہے ہیں یعنی اب دختر کو ترکہ دلوا رہے ہیں اور جہیز کے لئے قانوناً ایک حد مقرر کر دی گئی ہے اور اس کے بالمقابل مسلمانوں نے یہ کیا کہ ہندوانہ اصول پر جمے ہوئے ہیں جہاں قانون مجبور کرے وہاں ترکہ تو دے دیتے ہیں لیکن جہیز کو ایسی لازمی شرط ازدواج قرار دے رکھا ہے کہ اس کی فکر میں مرتے رہتے ہیں اور اس کا یہ اثر ہوتا ہے کہ اہل جاہلیت کی طرح بیٹی کی ولادت کو اپنے لیے ایک بڑی مصیبت تصور کرتے ہیں۔

رسم جہیز کس طرح آگئی

یہاں تک تو خیر کچھ غنیمت تھا اس لیے کہ مسلمانوں کو جب بھی یہ احساس ہوگا کہ جہیز محض ہندوؤں کی ایک رسم ہے تو وہ اسے ترک کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے لیکن غضب تو یہ ہوا کہ انہوں نے اسے سنت رسول بھی قرار دے دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ سنت کے بغیر دین مکمل نہ ہو تو ازدواج بھی بغیر سنت جہیز کے مکمل نہیں ہو سکتا۔ پھر سب سے زیادہ دلچسپ استدلال جہیز کے سنت ہونے پر یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جہیز دیا تھا جس میں بان کی چارپائی، چکی، مٹی کے گھڑے، فیل دندان کے کنگن، چاندی کا ہار، مشکیزے اور اذخر سے بھری ہوئی توشک تھی۔ گویا مقدمات کی ترتیب یوں ہوئی کہ۔۔۔ حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو فلاں فلاں چیزیں جہیز میں دیں۔ لہٰذا جہیز دینا سنت ٹھہرا۔ اور سنت کے بغیر دین مکمل نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا جہیز کے بغیر ازدواج مکمل نہیں ہوگا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا؟ کہ ایک غیر اسلامی اور خالص ہندوانہ رسم کس طرح رواج پا گئی۔

مہر کی بجائے جہیز

اب ہماری معروضات کو بھی بغور سن لیجئے۔ آپ کے سامنے خدا کی کتاب کھلی ہے احادیث کے دفتر موجود ہیں۔ ہر مشرب کی کتب فقہ لکھی ہوئی ہیں۔ آپ کو ہر ایک جگہ ذکر مہر کی تصریح ملے گی۔ قرآن نے اسے فریضہ، صدقات اور اجر کہا ہے۔ احادیث میں اسے صداق اور مہر بھی کہا گیا ہے۔ فقہ میں اس کے مستقل ابواب موجود ہیں اور ہر جگہ اسے ایک واجب الادا قرض بتایا گیا ہے۔ حتیٰ کہ مسند احمد کی روایت ہے کہ:

من تزوج امرأة بصداق و نوى ان لا يؤديه فهو زان

"جو شخص ایک عورت سے کسی مہر پر نکاح کرے اور نیت یہ ہو کہ اسے ادا نہیں کرے گا تو
اس کا شمار زانیوں میں ہے"۔

اور قرآن میں تو بار بار اس کی تاکید آئی ہے کہ عورتوں کو ان کا مہر خوش دلی کے ساتھ ادا کرو۔ سب کا

ذکر یہاں مقصود نہیں۔ عرض یہ کرنا ہے کہ مہر کے سارے احکام قرآن میں، حدیثوں میں، اور فقہ میں وضاحت کے ساتھ موجود ہیں لیکن جو چیز آپ کو کہیں بھی نہیں ملے گی وہ ہے جہیز کا ذکر۔۔۔ قرآن اس کے ذکر سے قطعاً خالی ہے۔ احادیث میں اس کا کہیں ذکر نہیں۔ حتیٰ کہ فقہ میں کہیں کوئی باب الجہیز موجود نہیں۔ اب خود ہی اس سوال کو حل کیجیے کہ یہ جہیز سنت کیسے بن گیا؟

پھر اس پر بھی غور فرمایئے کہ حضور اکرم ﷺ کی اور بھی تین صاحبزادیاں تھیں۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا، حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ لیکن کیا آپ نے کبھی یہ بھی سنا کہ حضور ﷺ نے زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یہ یہ چیزیں جہیز میں دیں۔ یا رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا و ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جہیز دیا جس میں فلاں فلاں چیزیں تھیں۔ اسے بھی جانے دیجیے۔ حضور ﷺ کے شرف زوجیت میں کتنی امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن آئیں لیکن آپ نے کہیں یہ بھی پڑھا ہے کہ عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جہیز میں یہ چیزیں موجود تھیں؟ یا حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا وسودہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا یا دوسری ازواج مطہرات رضی اللہ تعالیٰ عنہن فلاں فلاں چیزیں اپنے ساتھ جہیز میں لائی تھیں؟ چلیے جانے دیجئے۔ دوسرے بے شمار صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے بھی شادیاں فرمائیں لیکن کتنوں کے متعلق آپ نے کبھی یہ ذکر پڑھا ہے کہ ان کی ازواج "سنت رسول ﷺ" کے مطابق اپنے ساتھ جہیز لائی تھیں؟ پھر ذرا عقل پر زور دے کے سوچیے کہ آخر یہ سنت رسول ﷺ کی کونسی قسم ہے جو ازدواج فاطمہ زہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے سوا کہیں نظر نہیں آتی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ حقیقت کچھ اور ہو اور ہم نے فرض کر لیا ہو کچھ اور ہاں اصلیتاً یہی بات ہے۔ آیئے ذرا اس پر غور کریں۔

حقیقت حال

اس سے انکار نہیں ہو سکتا ہے حضور ﷺ نے وہ چیزیں (جن کا ذکر اوپر ہوا) جناب فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیں لیکن کیا یہ وہی چیز تھی جسے ہم عرف عام میں "جہیز" کہتے ہیں؟ یقیناً نہیں۔ جہیز کی اصطلاح سے اسے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پھر یہ کیا تھا؟ اسی مسئلے پر اس وقت غور کرنا ہے۔ ذرا توجہ سے کام لیکر حقیقت حال پر غور فرمایئے۔

حضور ﷺ جناب فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ دونوں کے کفیل و سرپرست تھے اس لیے دونوں کے ازدواج کا اہتمام بھی حضور ﷺ ہی کو کرنا تھا۔ جناب علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کوئی الگ گھر نہ تھا۔ حضور ﷺ کو ایک الگ گھر بسانا تھا اس لیے اس کا انتظام بھی حضور ﷺ ہی فرما رہے تھے۔ گھرداری کے انتظام کے لیے جو کچھ مختصر سا اہتمام حضور ﷺ نے مناسب سمجھا کر دیا۔ سونے کو چارپائی اور اذخر (گھاس) بھری توشک اور تکیہ، مشکیزے، گھڑے، چکی، رہا چاندی کا ہار تو وہ یوں بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی کا تھا جو آپ کو سیدہ خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ترکے میں ملا تھا۔ یہ سارا انتظام حضور ﷺ کو اس لیے کرنا پڑا کہ آپ کو

ایک الگ گھر بسانا تھا۔ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا پہلے سے کوئی الگ گھر ہوتا تو حضور ﷺ اتنا کچھ بھی نہ کرتے۔

حضرت ابو العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا گھر پہلے سے موجود تھا اس لیے سیدہ زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بیاہنے کے لیے حضور ﷺ نے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا الگ گھر بھی پہلے سے موجود تھا اس لیے سیدہ رقیہ اور سیدہ ام کلثوم رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو بیاہنے میں حضور ﷺ کو ایسے کسی اہتمام کی ضرورت نہ پڑی۔ اسی طرح حضور ﷺ کی زوجیت میں جو امہات المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہن آئیں ان کے والدین کو بھی ایسے کسی انتظام کی حاجت نہ تھی۔ لیکن سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیثیت ان سب سے مختلف تھی۔ اب تک وہ حضور ﷺ کے ساتھ ہی رہتے تھے اور جب ازدواج فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہوا تو سارا اہتمام از سر نو کرنا پڑا۔ سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس کوئی الگ گھر نہ تھا۔ ایک انصاری حارثہ بن نعمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا ایک گھر حضور ﷺ کی خدمت میں اسی مقصد کے لیے خوشی خوشی پیش کر دیا جس میں یہ پاکیزہ نیا جوڑا منتقل ہو گیا۔ اور گھرداری کے فقیرانہ اسباب وہاں بھیج دیے گئے۔ یہ جہیز نہ تھا۔ صرف ایک نیا انتظام خانہ داری تھا۔ اگر جہیز ہوتا تو حضور ﷺ اپنی ہر بیٹی کو اسی طرح جہیز دیتے اور ہر ام المومنین رضی اللہ تعالیٰ عنہا بھی اپنے ساتھ حضور ﷺ کے ہاں جہیز لاتیں۔ یہ ہے اصل حقیقت جسے "جہیز" کا نام دے دیا گیا ہے اور اسے سنت رسول ﷺ سمجھ لیا گیا ہے۔

ایک اور بات

اس کے جہیز نہ ہونے کی ایک اور دلیل بھی سن لیجیے۔ جناب خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متروکات کے سوا دوسری چیزیں حضور ﷺ نے کہاں سے مہیا فرمائی تھیں؟ یہ بھی یاد رکھنے کے قابل چیز ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حق مہر پہلے ہی لے لیا تھا۔ یہ ایک حطمیہ زرہ تھی جو حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ سوا سو روپے کی رقم (تقریباً پانچ سو درہم) میں فروخت کی تھی۔ یہی مہر کی رقم حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور ﷺ کی خدمت میں لے کر آئے اور اسی رقم سے حضور ﷺ نے گھرداری کا سارا سامان اور کچھ خوشبو وغیرہ منگوائی تھی۔ ذرا سوچیے کہ جہیز کی یہی صورت ہوتی ہے؟ اگر لوگ فی الواقع جہیز کو سنت سمجھتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اسے زرِ مہر ہی سے مہیا بھی کریں۔

غلط فہمی کی ابتداء

اب آیئے ذرا اس پر غور کریں کہ جہیز کی یہ غلط فہمی کیسے پیدا ہوئی؟ بات یوں چلی کہ نسائی وغیرہ کی روایت میں ہے کہ:

جهز رسول الله ﷺ فاطمة في خميل ... الخ

حضور ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے لیے اونی چادر اور فلاں فلاں چیزیں مہیا فرمائیں۔ یہاں جھز کے معنی کسی دور میں "جہیز دیا" کر لیے گئے اور یہ غلطی چل پڑی۔ رفتہ رفتہ اس پر اس غلط فہمی کے دبیز پردے پڑتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ آخر کار لوگوں نے جہیز کو سنت رسول ﷺ بنا چھوڑا۔

جھز تجهیزا کے معنی ہیں سامان تیار کرنا مہیا کرنا خواہ وہ کسی مسافر کے لیے ہو یا کسی دلہن کے لیے یا کسی میت کے لیے۔ سورۂ یوسف میں ہے:

فلما جهزهم بجهازهم...

"جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کا سامان تیار کر دیا"

یہاں کون یہ ترجمہ کر سکتا ہے کہ جب یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کو جہیز دیا۔

ہم جب "میت کی تجہیز" کا لفظ بولتے ہیں تو اس سے "جہیز" کون مراد لیتا ہے! احادیث میں بہت جگہ یہ لفظ آیا ہے اور کہیں بھی "جہیز" کے معنی میں نہیں۔ من جهز غازيا ...(بخاری)۔ من جهز جيش العسرة ...(بخاری)۔ كنت اجهز للشام ...(ابن ماجہ)۔ اني لا جهز جيشي ...(بخاری)۔ كنا في من جهز عائشة ...(مسند احمد)۔ فجهزت نصف الجيش ... (ترمذی) وغیرہا

یہی شکل دلہن کی ہوتی ہے کوئی والدین اپنی بچی کو شادی کے بعد گھر سے اس طرح رخصت نہیں کرتے کہ اس کے کپڑے بھی اتروا لیں۔ پدری اور مادری محبت بہت کچھ ساتھ کرنے پر مجبور کر دیتی ہے اور یہ سلسلہ صرف رخصتی کے وقت تک ہی محدود نہیں رہتا۔ والدین ساری عمر اپنی استطاعت و توفیق کے مطابق اسے دیتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ معروف جہیز نہیں ہوتا۔ وہ عرصہ دراز تک کسی مجبوری کی وجہ سے اس کی شادی نہ کر سکیں جب بھی اسے کچھ نہ کچھ دیتے ہی رہتے ہیں لیکن اسے جہیز نہیں کہتے۔

بس حضور ﷺ نے ایک الگ گھر بسانے کے لیے جو کچھ بھی جناب فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو دیا اس کو "جہیز" سمجھنا ایک ایسی غلطی ہے جس کے حق میں کوئی معقول دلیل نہیں نظر آتی۔ حضور ﷺ نے کبھی کسی موقع پر بھی والدین کو اپنی بچی بیاہنے کے لیے جہیز دینے کا حکم یا کوئی ترغیب نہیں دی۔ سنت نبوی ﷺ میں تو یہ اصطلاح ہی کبھی نہیں رہی یہ سارے پھندے ہم نے خود اپنی گردن میں ڈال کر اپنے لیے مشکلات پیدا کر لی ہیں جب سے سوشل زندگی اجیرن ہو گئی ہے اور شادی بیاہ کی آسانیاں مصیبتوں کے پہاڑ میں تبدیل ہو گئی ہیں۔ جو سہولتیں ہیں وہ خدا اور رسول ﷺ کی طرف سے ہیں اور جو دشواریاں اور مشکلات ہیں وہ خود ہماری اپنی لائی ہوئی ہیں۔ جہیز کی فکر میں گھل گھل کر مرنا اور اس فکر کی وجہ سے دختروں کو ایک مصیبت سمجھنا کوئی اسلامی شعار نہیں۔ یہ صرف برادران وطن کی رواں پیروی ہے جسے اب وہ خود چھوڑ رہے ہیں۔ اور ہم ہنوز اس سے نہ فقط چمٹے ہوئے ہیں بلکہ غضب یہ ہے کہ اسے سنت رسول ﷺ اور لازمہ ازدواج بھی سمجھے ہوئے ہیں۔

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی؟

بہار، سابق پنجاب اور سابق سرحد کے رواج:

ہندوستان میں صوبہ بہار کے مسلمانوں میں۔۔۔ اب تک ایک ہندوانہ رسم باقی ہے جسے "تلک" کہتے ہیں۔ تلک کا مفہوم یہ ہے کہ گویا لڑکے کی تجارت ہوتی ہے۔ لڑکا لڑکی والوں سے یہ کہتا ہے کہ تم جہیز میں فلاں فلاں چیزیں دو یا اتنی رقم دو تو میں تمہاری لڑکی سے شادی کروں گا اور بے چارے مسلمان اس خیال سے کب تک لڑکی کو بٹھائے رہیں گے اس کی شرطیں قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ خطبہ نکاح میں تو ہر جگہ یہی ارشاد نبوی ﷺ پڑھا جاتا ہے کہ النكاح من سنتي ومن رغب عن سنتي فليس مني (نکاح میری سنت ہے اور جو میری سنت سے روگردانی کرے وہ میری جماعت میں نہیں) لیکن اتباع سنت کا یہ انداز بھی قابل داد ہے کہ ساتھ ہی ساتھ "تلک" کی شرط کو بھی منظور کر لیتے ہیں اور جہیز کی مفروضہ سنت کو بھی لازمۂ ازدواج تصور کرتے ہیں اور سابق صوبہ سرحد میں اس کے بالکل برعکس لڑکی والے لڑکے سے کہتے ہیں کہ اتنے روپے لاؤ تو ہم لڑکی دیں گے۔ پھر وہ اسی رقم کا خاصہ حصہ شادی کے تمام انتظامات میں لگا دیتے ہیں۔ گویا بہار میں لڑکے فروخت ہوتے ہیں اور یہاں لڑکیاں۔

یہ عام قاعدہ ہے کہ جب فروع پر زور دیا جائے تو اصول کی طرف سے بے توجہی ہو جاتی ہے جب غیر ضروری شے کو لازمی تصور کر لیا جائے تو ضروری چیز کی گرفت ڈھیلی ہو جاتی ہے۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ ایک غیر ضروری چیز جہیز کو لازمۂ ازدواج یقین کر لیا تو مہر جیسی ضروری شے محض ایک بے جان، بے اثر اور ناقابل توجہ رسم بن کر رہ گئی۔ صوبہ بہار میں عام طور پر کم از کم چالیس ہزار روپیہ مع "دو دینار سرخ" دین مہر رکھا جاتا۔ خواہ دولہا چالیس روپے کی بھی سکت نہ رکھتا ہو۔ ایسے مواقع پر دولہا دلہن، نکاح خواں، گواہ، حاضرین، سسرال والے اور میکے والے سب جانتے ہیں کہ زر مہر ساری عمر بھی ادا نہیں ہوگا لیکن نکاح بڑے ٹھاٹھ سے ہوتا ہے۔ نکاح خواں پوچھتا ہے کہ۔۔۔ قبول کیا؟ دولہا جواب دیتا ہے۔۔۔ جی قبول کیا۔ حالانکہ دونوں ایک دوسرے کے کذب کو سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ غیر ضروری چیز پر زور دینے کا نتیجہ کیا نکلا؟ ضروری غیر ضروری بن گیا۔ چونکہ وہاں مہر کبھی ادا نہیں ہوتا اس لیے وہاں اصطلاح مہر کو کہتے ہیں دین مہر یعنی کبھی نہ اترنے والا قرض۔

سابق صوبہ پنجاب میں اس نے ایک دوسری شکل اختیار کر لی۔ یعنی مہر صرف بتیس روپے قرار پائے۔ اور اس کا نام "مہر شرعی" رکھ دیا گیا۔ یعنی اگر اس سے کم زیادہ ہوا تو وہ غیر شرعی مہر ہوگا۔ حالانکہ مہر کا معاملہ صرف اس قدر ہے کہ شوہر آسانی سے ادا کر سکے۔ اور بیوی کے وقار Status سے گرا ہوا نہ ہو۔ یہ ایک روپے سے لے کر ایک کروڑ روپے تک ہو سکتا ہے۔

یہ سب نتائج ہیں جہیز کی ہندوانہ رسم کو ضروری سنت قرار دینے کے۔ جب جہیز ضروری ٹھہرا تو مہر خود بخود غیر ضروری یا غیر متوازن ہو گیا۔ جہیز کو لازمۂ ازدواج سمجھنے سے مسلمان قوم کے معاشی توازن میں جو بگاڑ پیدا ہوا وہ الگ ہے۔ ہم نے کتنے خاندانوں کو اسی چکر میں مٹتے اور تباہ ہوتے بھی دیکھا ہے۔ وہ محض جہیز کی غیر ضروری رسم پوری کرنے کے لیے سودی قرضہ لیتے ہیں۔ اپنی جائدادیں رہن رکھ دیتے ہیں جو کبھی واگذار نہیں ہوتیں۔ ادھر مہر کی بڑی رقمیں ادا نہیں ہوتیں اور ادھر جائداد پر لیا ہوا قرضہ کبھی ادا نہیں ہوتا۔ اور شادی کا فرض قرض کے چکر میں پھنس کر رہ جاتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس غیر ضروری رسم کو جو در اصل بدعت ہے ختم کر دیا جائے۔

ابن ماجہ کتاب الزہد باب آل محمد کے الفاظ ہیں وهما في خميل لهما قد كان رسول الله ﷺ جهزهما بها یعنی حضور ﷺ علی و فاطمہ رضی اللہ عنہما کے پاس تشریف لائے تو وہ دونوں ایک ہی چادر اوڑھے ہوئے تھے اور یہ چادر حضور ﷺ ہی نے ان دونوں کے لیے مہیا فرمائی تھی۔ کیا یہاں جہز کے معنی یہ لیے جا سکتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ نے حضرت علی کو بھی جہیز دیا تھا۔

ترا اندیشہ افلاکی نہیں ہے
تری پرواز لولاکی نہیں ہے
یہ مانا اصل شاہینی ہے تری
تری آنکھوں میں بیباکی نہیں ہے
محبت کا جنوں باقی نہیں ہے
مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج، دل پریشاں، سجدہ بے ذوق
کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

کیا رسول اللہ ﷺ نے اجرت پر بکریاں چرائیں؟

مفتی محمد خان قادری

س: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے ہر نبی نے بکریاں چرائی ہیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! آپ نے بھی؟ فرمایا:

کنت ارعاھا علی قراریط لاھل مکۃ (البخاری، کتاب الاجارہ)

"میں نے بھی اہل مکہ کی بکریاں قراریط (اجرت) پر چرائی ہیں"۔

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کی بکریاں اجرت پر چرائی ہیں۔ حالانکہ اہل علم بیان کرتے ہیں کہ ہر نبی اپنے دور کا معزز پیشہ اختیار کرتا ہے۔ لیکن لوگوں کی بکریاں اجرت پر چرانا تو معزز پیشہ نہیں پھر سید الانبیاء ﷺ نے یہ کیوں اختیار فرمایا؟ اس کی وضاحت کتاب و سنت کی روشنی میں کی جائے۔

(سائل: محمد اختر رضا قادری، سرگودھا)

جواب: کتاب و سنت کے مطالعہ کے بعد محققین علماء نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہرگز ہرگز لوگوں کی بکریاں اجرت پر نہیں چرائیں۔ ہاں آپ نے اپنی بکریاں چرائی ہیں۔ پہلے ہم کتاب و سنت کے دلائل ذکر کرتے ہیں پھر مذکورہ حدیث کا مفہوم سامنے لائیں گے تاکہ معاملہ واضح ہو جائے۔

قرآن اور لفظ راعنا

مجلس میں آپ ﷺ جب کسی معاملہ کے بارے میں گفتگو فرماتے، اگر حاضرین میں سے کسی کو کوئی بات سمجھ نہ آتی تو عرض کرتے "یا رسول اللہ ﷺ! راعنا"۔ اے اللہ کے رسول ہماری رعایت کیجئے۔ آپ کی مجلس میں منافقین اور یہود بھی آتے تھے۔ انہوں نے اپنے دل کے خبث اور حسد و بغض کے اظہار کے لیے یہ طریقہ اپنایا کہ وہ بھی لفظ "راعنا" استعمال کرتے مگر ذرا زبان کو مروڑ کر پڑھتے تاکہ اس سے حضور ﷺ کی توہین کا پہلو پیدا کیا جا سکے۔ وہ کیا معنی مراد لے کر استعمال کرتے تھے؟ اہل تفسیر لکھتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعے حضور علیہ السلام کو

"اپنا چرواہا" قرار دینے کی ناپاک جسارت کرتے تھے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا اور یہ آیت کریمہ نازل فرمائی۔[٦]

یا ایھا الذین امنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا وللکفرین عذاب الیم"۔

"اے اہل ایمان اب راعنا مت کہو بلکہ انظرنا (ہم پر نظر کرم کیجئے) کہو اور آپ کی
گفتگو خوب اچھی طرح سنو اور کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے"۔

اس آیت مبارکہ کے تحت چند مفسرین کی تحریر کردہ آراء ملاحظہ کیجئے جو ہمارے مدعیٰ پر روشن دلیل ہیں۔

۱۔ امام فخر الدین رازی نے لفظ "راعنا" کی سات تفاسیر اور معانی بیان کئے ہیں۔ ان میں سے ایک کے الفاظ یہ ہیں:

ثالثھا ان الیھود کانوا یقولون راعینا ای انت راعی غنمنا فنھاھم اللہ عنھا۔

"تیسری صورت یہ تھی کہ یہود لفظ راعنا کو راعینا کے طور پر ادا کرتے یعنی" اے ہمارے بکریاں چرانے والے!" تو اللہ تعالیٰ نے ایسے کلمہ کو حرام قرار دیا۔ (تفسیر کبیر ۳: ۲۲۳)

۲۔ علامہ محمود آلوسی اس لفظ کی تشریح میں مفسرین کا ایک قول ان الفاظ میں نقل کرتے ہیں:

قیل بل کانوا یشبعون کسر العین و یعنون لعنھم اللہ تعالیٰ انہ وحاشاہ صلی اللہ علیہ وسلم بمنزلۃ خدمھم و رعاۃ غنمھم و قد کانوا یقولون ذلک مظھرین الاحترام والتوقیر مضمرین ما یستحقون بہ جھنم و بئس المصیر۔

"یہود لفظ راعنا کو کھینچ کر پڑھتے۔ اللہ تعالیٰ کی لعنت ان پر ہو۔ حاشا وکلا آپ ﷺ کی ذات اقدس اس سے پاک ہے ان کا مقصد یہ تھا کہ آپ ہمارے بطور خادم اور ہماری بکریاں چرانے والے ہیں۔ اس سے وہ بظاہر آپ کا احترام اور توقیر کرتے مگر دل و دماغ میں ایسی بات چھپاتے جس سے وہ اس جہنم کے مستحق ٹھہرے جو نہایت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

علامہ آلوسی کے یہ الفاظ "اللہ ان پر لعنت کرے" اور "حضور اکرم ﷺ کی ذات اقدس اس سے پاک ہے" نہایت ہی قابل توجہ ہیں۔

۳۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے سورۃ البقرہ میں لفظ راعنا کا مفہوم واضح کرنے کے لیے "یہود کی شرارت" کے عنوان کے تحت یہ گفتگو تحریر کی ہے:

"اوپر گزر چکا ہے کہ یہ یہود کی ان شرارتوں اور اعتراضات سے متنبہ کیا جا رہا ہے جو وہ آنحضرت ﷺ اور قرآن کے خلاف اس لیے کرتے تھے کہ اپنے اندر کی بھڑاس نکالیں اور ہو سکے تو اس طرح مسلمانوں کو

اسلام کی نعمت عظمیٰ سے محروم کریں۔ سیاق و سباق پر نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی محض منافقانہ اعتراض کے لیے آنحضرت ﷺ کی مجالس میں شریک ہوتے اور اپنے شوق استفادہ اور ذوق تعلم کے اظہار کے طور پر راعنا کا لفظ بار بار دہراتے تاکہ حاضرین مجلس پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ علم کے بڑے طالب اور قدر دان لوگ ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اس لفظ کو صرف اس لئے استعمال کرتے تھے کہ ذرا سا زبان کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے سے اس سے حضور اکرم ﷺ کی توہین کا پہلو پیدا کیا جا سکتا تھا۔ راعنا کو ذرا نیچے کی طرف دبا کر ادا کیجئے تو بڑی آسانی سے راعینا بن جائے گا جس کے معنی "ہمارے چرواہے" کے ہیں۔ یہود کی اس شرارت کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے۔

من الذین ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعه ویقولون سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع وراعنا لیا بالسنتھم وطعنا فی الدین۔

"یہود میں وہ لوگ ہیں جو کلام کو اس کے موقع محل سے ہٹاتے ہیں اور اپنی زبانوں کو لپکا کر کہتے ہیں سمعنا وعصینا واسمع غیر مسمع اور راعنا دین پر طنز کرنے کے لیے"۔

اس آیت سے واضح ہے کہ یہ شرارت راعنا کے تلفظ میں زبان کو لپکا کر پیدا کی جاتی تھی۔ (تدبر قرآن، ۱:۲۵۰۔۲۵۱)

دوسرے مقام پر سورۃ النساء کی تفسیر میں لفظ راعنا کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"راعنا" کے لفظی معنی ہیں "ذرا ہماری رعایت فرمایئے" اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف اور حکیمانہ ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اس کو مکرر سننا چاہے تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لئے جس طرح ہمارے ہاں کہتے ہیں "پھر ارشاد ہو" یا "پھر فرمایئے" اسی طرح عربی میں "راعنا" کہتے ہیں۔ یہ لفظ سامع کے ذوق و شوق اور اس کی رغبت علم کی دلیل ہے لیکن یہودی اشرار "لی لسان" یعنی زبان کو توڑ مروڑ کے ذریعے سے اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال لیتے۔ اس کی شکل یہ ہوتی کہ "راعنا" میں "ع" کے کسرہ کو ذرا دبا دیجئے تو یہ لفظ "راعینا" بن جائے گا اور اس کا معنی ہوگا "ہمارا چرواہا"۔ قرآن نے یہود کی اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو سرے سے مسلمانوں کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا اور اس کی جگہ "انظرنا" کے استعمال کی ہدایت فرمائی جس کے معنی ہیں "ذرا ہمیں مہلت عنایت ہو" "ذرا پھر توجہ فرمایئے" یعنی مفہوم کے لحاظ سے یہ ٹھیک ٹھیک "راعنا" کا قائم مقام ہے اور اس میں لہجے کے بگاڑ سے کسی بگاڑ کے پیدا کیے جانے کا کوئی موقع نہیں ہے"۔ (تدبر قرآن، ۲:۸۴)

آگے بڑھنے سے پہلے مولانا کا ہی "الفاظ سے متعلق ایک نفسیاتی حقیقت" کے تحت تحریر کردہ اقتباس بھی پڑھیے۔

"الفاظ کے متعلق یہ نفسیاتی حقیقت ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگر ان کے اندر کوئی روح فساد موجود ہو یا سوء استعمال سے پیدا کر دی گئی ہو تو پھر سلامتی ان سے دور رہنے میں ہی ہے ورنہ ان کا زہر غیر شعوری طور پر ان کے

بولنے والوں اور سننے والوں کے اندر بھی سرایت کر کے رہتا ہے۔ مسلمانوں کو اس چھوت سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے لفظ "راعنا" کے استعمال کی ممانعت فرما دی"۔ (تدبر قرآن، ۱:۲۵۱)

آیت مذکورہ اور اس کی تفسیر سے اخذ شدہ نکات

۱۔ امت مسلمہ کو سب سے پہلا سبق اس آیت نے یہ دیا ہے کہ اللہ کے حبیب ﷺ کے بارے میں جب گفتگو ہو خواہ تحریر ہو یا تقریر تو ہر اس لفظ سے احتراز لازم و فرض ہے جس سے آپ کی بے ادبی کا کوئی شائبہ ہو۔ علامہ شوکانی اسی آیت کے تحت لکھتے ہیں:

وفی ذلک دلیل علی انه ینبغی تجنب الالفاظ المحتملة للسب و النقص وان لم یقصد المتکلم بھا ذلک المعنی للشتم سداً للذریعة و دفعاً للوسیلة وقطعاً لمادة المفسدة والتطرق الیه.

"اس آیت مبارکہ نے یہ اصول دیا ہے کہ آپ ﷺ کے بارے میں ہر وہ لفظ لکھنا اور بولنا جس میں سب و نقص کا احتمال ہو اس سے بچنا ضروری ہے۔ اگرچہ متکلم ان الفاظ سے یہ معنی مراد بھی نہ لے رہا ہو تاکہ ہر طرح سے بے ادبی اور توہین، فتنہ و فساد کی راہ کو مسدود کر دیا جائے"۔ (فتح القدیر، ۱:۱۲۳)

۲۔ کوئی لفظ بظاہر کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو اگر اس کو سوء ادب کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہو تو ایسا لفظ بولنا بھی توہین شمار ہوگا۔ لفظ "راعنا" نہایت خوبصورت لفظ تھا مگر اہل نفاق و حسد نے اسے بے ادبی کا ذریعہ بنایا تو اللہ تعالیٰ نے یک قلم اسے مسلمانوں کی گفتگو سے خارج کر دیا۔

۳۔ لفظ راعنا کے متعدد مفاہیم ضرور ہیں مگر قرآنی الفاظ وراعنا لیا بالسنتھم (وہ اسے زبان سے لپکا کر پڑھتے) ۔ اس کے یہی معنی اجاگر کر رہے ہیں کہ وہ اس کے ذریعے آپ کو چرواہا قرار دینے کی بھونڈی کوشش کرتے تھے۔ اس کی تفصیل کے لیے مولانا اصلاحی کے دوسرے اقتباس پر دوبارہ نظر ڈال لیجئے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کے حبیب ﷺ کو "چرواہا" کہنا قرآنی تعلیمات کے خلاف ہے۔ جب قرآن ایسا لفظ بولنا گوارا نہیں کرتا جس میں چرواہا بنانے کی کوشش ہو تو وہ صراحتاً چرواہا کہنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔

۵۔ اگر واقعۃً آپ نے اجرت پر لوگوں کی بکریاں چرائی ہوتیں تو قرآن ڈنکے کی چوٹ پر ایسے الفاظ کے استعمال سے منع نہ کرتا۔

۶۔ اس لفظ سے منع کرنا از خود اس بات پر دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ کو ایسے معاملہ سے ہی پاک رکھا تاکہ مخالفین کسی موقع پر بھی اسے حقارت کا ذریعہ نہ بنائیں۔

۷۔ جب ہر جگہ غلط الفاظ کا زہر سرایت کر کے ذہن کو برباد کر دیتا ہے تو پھر حضور علیہ السلام کے بارے میں حد درجہ احتیاط ضروری ہے۔ اگر بار بار آپ کو چرواہا لکھا جائے، پڑھا اور سنا جائے تو اس سے ذہنوں پر جو غلط اثرات

مرتب ہوں گے وہ کسی صاحب فہم و شعور سے مخفی نہیں۔ خصوصاً جب بچوں کو پڑھایا جائے جو عظمت محنت وغیرہ سے آگاہ ہی نہیں ہوتے۔

مذکورہ حدیث کا صحیح مفہوم

رہا یہ معاملہ کہ مذکورہ حدیث میں اس بات کا ذکر ہے کہ آپ نے اجرت پر اہل مکہ کی بکریاں چرائیں تو اس سلسلہ میں درج ذیل گذارشات نہایت ہی قابل توجہ ہیں۔

۱۔ اس حدیث میں اس بات کا کہیں ذکر نہیں۔ الفاظ حدیث اور ان کا ترجمہ ملاحظہ کیجئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا:

ما بعث اللہ نبیاً الا رعی الغنم فقال اصحابہ وانت فقال نعم کنت ارعاھا علی قراریط لاھل مکۃ.

”اللہ تعالیٰ کے ہر نبی نے بکریاں چرائیں۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ آپ نے بھی؟ فرمایا: میں نے اہل مکہ کی بکریاں مقام قراریط پر چرائی ہیں“

بعض لوگوں کی غلط فہمی

اس حدیث میں لفظ قراریط استعمال ہوا ہے جو ایک جگہ کا نام ہے لیکن بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ نقدی (اجرت) کرتے ہوئے کہا کہ یہ قیراط کی جمع ہے اسی بنا پر شیخ سوید بن سعید نے حدیث کا ترجمہ یوں کیا:

کل شاۃ بقیراط

”ایک بکری کی اجرت ایک قیراط تھی“۔ (ابن ماجہ، کتاب التجارت)

علماءِ محققین کی رائے

علماء محققین نے ان کا ذکر کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ قراریط مکہ میں ایک جگہ کا نام ہے۔ یہ قیراط کی جمع نہیں۔

۱۔ حدیث، لغت اور دیگر فنون کے امام شیخ ابراہیم بن اسحاق الحربی قراریط کا معنی یوں بیان کرتے ہیں:

ان قراریط اسم مکان فی نواحی مکۃ قرب اجیاد.

”قراریط اطراف مکہ میں اجیاد کے قریب ایک جگہ کا نام ہے“۔ (عمدۃ القاری ۱۲: ۸۰)

۲۔ امام ابن جوزی کے استاذ شیخ محمد ناصر شیخ سوید کی تفسیر قراریط کا رد کرتے ہوئے کہتے ہیں

اخطاء سوید فی تفسیرہ القیراط بالذھب والفضۃ اذلم یرع النبی ﷺ لاحد باجرۃ قط وانما کان یرعی غنم اھلہ.

”شیخ سوید نے قیراط کی تفسیر سونا چاندی سے کر کے غلطی کی ہے کیونکہ رسالت مآب ﷺ نے ہرگز ہرگز کسی کی

بکریاں اجرت پر نہیں چرائیں۔ ہاں آپ نے صرف اپنی بکریاں چرائی ہیں“۔ (شرح الشفا للقاری ۲: ۳۶۰)

۳۔ امام المحدثین ابن جوزی نے دونوں قول کا جائزہ لینے کے بعد کہا

الذی قالہ الحربی اصح

”شیخ حربی نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ نہایت ہی صحیح ہے“۔ (عمدۃ القاری ۱۲: ۸۰)

۴۔ اسی طرح ملا علی قاری نے بھی شیخ ابراہیم الحربی کے قول کو ترجیح دی اور اسے صحیح قرار دیتے ہوئے کہا:

والصحیح ما فسرہ بہ ابراھیم بن اسحاق الحربی الامام فی الحدیث واللغۃ و غیرھما ان قراریط اسم مکان فی نواحی مکہ.

”امام ابراہیم بن اسحاق حربی کی تفسیر ہی صحیح ہے کہ قراریط اطراف مکہ میں جگہ کا نام ہے۔ اور وہ حدیث، لغت اور دیگر علوم کے امام ہیں“۔ (شرح الشفا للقاری ۲: ۳۶۰)

۵۔ شیخ المحدثین امام بدرالدین عینی نے تصنیف دلائل (جن کا ذکر کرتے آ رہا ہے) سے شیخ ابراہیم، شیخ محمد بن ناصر اور امام ابن جوزی کی تائید کر کے کہا:

انہ ما کان یرعی باجرۃ فاذا کان کذلک فلا دخل للقراریط من النقد فی ھذا الموضع.

”جب آپ ﷺ نے اجرت پر بکریاں چرائی ہی نہیں۔ لہٰذا اس حدیث میں لفظ قراریط کا اجرت سے کوئی تعلق نہیں“۔ (عمدۃ القاری ۱۲: ۸۰)

۶۔ امام ملا علی القاری تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

والمحققون انہ علیہ الصلوۃ والسلام لم یرع لاحد بالاجرۃ وانما رعی غنم نفسہ و ھذا لم یکن عیباً فی قومہ. واما روایۃ رعی بقراریط فقالوا انہ اسم موضع.

”محققین علماء نے واضح طور پر یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ نے اجرت پر کسی کی بکریاں نہیں چرائیں۔ ہاں آپ نے اپنی بکریاں چرائی ہیں اور یہ عیب نہیں۔ باقی رہی روایت قراریط تو علماء نے بتایا ہے کہ وہ جگہ کا نام ہے“۔ (شرح الشفاء للقاری ۲: ۳۳۸)

۷۔ علامہ شبلی نعمانی اس اختلاف کے بارے میں رقم طراز ہیں:

”قراریط کے معنی میں اختلاف ہے۔ ابن ماجہ کے شیخ سوید بن سعید کی رائے ہے کہ قراریط، قیراط کی جمع ہے اور قیراط درہم و دینار کے ٹکڑے کا نام ہے۔ اس بنا پر ان کے نزدیک حدیث کے یہ معنی ہیں کہ آنحضرت ﷺ اجرت پر لوگوں کی بکریاں چراتے تھے۔ اسی بنا پر بخاری نے اس حدیث کو باب الاجارۃ میں نقل کیا ہے لیکن ابراہیم حربی کا قول ہے کہ قراریط ایک مقام کا نام ہے جو اجیاد کے قریب ہے۔ ابن جوزی نے اس قول کو ترجیح دی

ہے۔ علامہ عینی نے اس حدیث کی شرح میں یہ بحث تفصیل سے لکھی ہے اور قوی دلائل سے ثابت کیا ہے کہ ابن جوزی کی رائے صحیح ہے''۔ (عمدۃ القاری ۱۲:۸۰)

نورالنمر اس میں یہ بحث اور تفصیل سے ہے اور اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔ (حاشیہ سیرت النبی، ۱:۱۷۹)

نوٹ: نورالنمر اس تلاش بسیار کے باوجود نہیں مل سکی۔ ملنے پر اس کے دلائل کو شامل کیا جائے گا۔

۸۔ اہل حدیث فاضل مولانا ابراہیم سیالکوٹی اس بحث کے آخر میں یہ رائے دیتے ہیں کہ:

''اس زمانہ میں مکہ میں اس کا رواج نہ تھا۔ بلکہ یہ اس مقام کا نام ہے جو مکہ میں اجیاد کے قریب ہے''۔ (سیرت المصطفیٰ ﷺ ۱:۱۳۸)

قول محققین کے تائیدی دلائل :

یہاں ہم کچھ ایسے دلائل کا بھی تذکرہ کر دیتے ہیں جو محققین کے قول کی تائید کرتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے تو اس پر سابقہ قرآنی آیت کے الفاظ ''لا تقولوا راعنا'' دال ہیں کہ حدیث میں قراریط سے مراد جگہ اور مقام لیا جائے تاکہ قرآن و حدیث میں تعارض لازم نہ آئے۔

۲۔ خود اس حدیث کے الفاظ دو طرح اس پر شاہد ہیں کہ لفظ قراریط سے اُجرت مراد لینا درست نہیں کیونکہ اس کے الفاظ ہیں:

كنت ارعاها على قراريط لاهل مكة۔

''میں نے اہل مکہ کی بکریاں قراریط پر چرائیں''۔

جو لوگ قراریط کا معنی اجرت کرتے ہیں وہ ''علی'' کو اس کے مجازی معنی ''با'' کرنے پر مجبور ہیں۔

حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

على بمعنى الباء وهى للسببية او المعاوضة وقيل انها هنا للظرفية

''یہاں علی، با کے معنی سببیت یا معاوضہ کے لئے ہے بعض نے کہا یہاں ظرفیت کے لئے ہے''۔ (فتح الباری، ۴:۳۳۹)

حالانکہ اصول یہ ہے کہ کسی لفظ کو مجازی معنی میں لے جانا اس وقت مجبوری ہوتی ہے جب اس کا حقیقی معنی وہاں لینا درست نہ ہو اور محل حقیقی معنی کو قبول ہی نہ کرے لیکن جہاں حقیقی معنی لینا درست ہو وہاں مجازی معنی لینا خلاف اصول ہے۔ حدیث مذکورہ میں جب ''علی'' اپنے حقیقی معنی میں فٹ ہی نہیں بلکہ احترام نبی کا ذریعہ ہے تو پھر مجازی معنی کی طرف کیوں جایا جائے۔ امام بدرالدین عینی نے یہی بات ان الفاظ میں کہی:

ان كلمة على فى اصل وضعها للاستعلاء، والاستعلاء حقيقة لا يكون الا على القراريط الذى هو اسم موضع وعلى القراريط من النقد يكون بطريق المجاز فلا يصار الى المجاز الا عند تعذر الحقيقة ولا تعذر هنا۔

''کلمہ ''علی'' کی وضع استعلاء کے لئے ہے اور حقیقی استعلاء اس صورت میں ثابت ہوگا جب قراریط جگہ کا نام ہو اور اگر قراریط کا معنی نقدی کیا جائے تو اب بطور مجاز ہوگا اور مجازی معنی کی طرف اس وقت رجوع کرنا پڑتا ہے۔ جب حقیقی معنی نہ لیا جا سکتا ہو۔ حالانکہ یہاں حقیقی متعذر نہیں''۔ (عمدۃ القاری ۱۲:۸۰)

الغرض ''علی'' کو اپنے استعلاء پر ہی رکھنا پڑے گا جو صراحۃً محققین کی تائید کر رہا ہے کہ قراریط اجرت نہیں بلکہ جگہ کا نام ہے۔

۳۔ دوسری کتب حدیث میں ''لاهل مكة'' (مکہ والوں کی بکریاں) کے الفاظ نہیں بلکہ وہاں ''لاهلى'' (میں اپنی بکریاں چرایا کرتا تھا) کے الفاظ ہیں''۔

ابوداؤد طیالسی، بغوی، ابن مندہ، ابونعیم اور ابن عساکر نے بشر بن حرب البصری سے مرسلاً اور امام احمد اور عبد بن حمید نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ ہم اونٹ اور بکری کی ملکیت پر فخر کیا کرتے تھے۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

بعث موسى وهو راعى غنم وبعث داود وهو راعى غنم وبعثت وانا راعى غنم لاهلى باجياد۔

''حضرت موسیٰ علیہ السلام مبعوث ہوئے تو انہوں نے بکریاں چرائیں اسی طرح داؤد علیہ السلام نے بکریاں چرائیں۔ میں نے بھی اپنی بکریاں مقام اجیاد میں چرائیں''۔ (مسند احمد ۳:۳۳)

امام ابن حجر کے مطابق یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔ (فتح الباری ۴:۳۳۹)

اس میں آپ نے دو باتوں کی تصریح فرما دی ہے:

۱۔ میں نے کسی کی بکریاں نہیں چرائیں بلکہ اپنی بکریاں چرائی ہیں۔

۲۔ دوسرا آپ نے جگہ کا نام لیا کہ میں نے مقام اجیاد پر بکریاں چرائیں جس سے واضح ہوتا ہے کہ زیر بحث حدیث میں بھی قراریط جگہ کا نام ہی لیا گیا ہے۔

دونوں احادیث میں تطبیق

محققین علماء نے ان دونوں احادیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا:

انه اراد المكان فعبر تارةً باجياد و تارةً بقراريط۔

''آپ کا مقصد جگہ کا بیان ہے کبھی آپ نے اجیاد کا نام لیا اور کبھی قراریط کا''۔ (سبل الہدیٰ ۲:۲۱۳)

بعض نے یوں تطبیق دی ہے کہ ایک حدیث میں یہ بیان ہے کہ میں نے اپنی بکریاں بغیر اجرت